www.cpsglobal.org

الرسالہ
Al-Risala

September 2015 • No. 466 • Rs. 20

مال زندگی کی ضرورت ہے، مال زندگی کا مقصد نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market

New Delhi-110 013

Tel. 011-41827083, 46521511

Fax: 011-45651771

email: info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Subscription Rates

Single copy ₹ 20

One year ₹ 200

Two years ₹ 400

Three years ₹ 600

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi-110 051

(Total Pages: 52)

ستمبر 2015

فہرست

قرأتِ فاتحہ، روحِ فاتحہ 4

نعمت کی تحدیث 5

محبت کا معاملہ 6

انسان کی تخلیق 7

غم کے بجائے دعا 8

تاریخ کا نیا دور 9

نبی امی 10

واما السائل فلا تنہر 11

آخرت پر ایمان 12

خدا کا عقیدہ 13

عاجلانہ اقدام، صابرانہ منصوبہ بندی 14

نصیحت کا صحیح طریقہ 15

آئڈیالوجی کی طاقت 17

دعوت کا اسلوب 18

دین میں استقامت 19

دورِ فتنہ 20

اعتدال کا مطلب 21

ایک اجتماعی اصول 22

فساد کی برائی 23

علمِ معرفت 24

ایمان اور عمل 25

ایک سنتِ رسول 26

امتیاز ابلیس کی سنت ہے 28

جنت کی دنیا 29

اجتہاد کا معاملہ 30

قتل سب سے بڑی برائی 31

ذاتی کمال، بصیرِ زمانہ 34

قدرت کا نظام 35

سب سے بڑا المیہ 36

حکمتِ حیات 37

حقیقی اطمینان 38

دو دنیائیں 39

انتہا پسندی 40

معافی، رائے بدلنا 41

کلام کا طریقہ 42

افادہ اور استفادہ 43

ہر صورتِ حال بہتر 44

ہر آدمی ایک کیس ہے 45

اپنی تعمیر آپ 46

خبر نامہ اسلامی مرکز 47

قرأتِ فاتحہ، روحِ فاتحہ

نماز کے مسائل میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جس کو قرأت فاتحہ خلف الامام کہا جاتا ہے۔ یعنی نماز کے وقت امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا۔ اس مسئلے پر فقہ کی کتابوں میں بہت زیادہ بحثیں ملتی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قاری کے اندر روحِ فاتحہ (spirit of fatiha) موجود ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ روح فاتحہ کے اہمیت اتنی ہے، جتنا کہ نماز کے لئے نیت۔ ایک فقہی مسئلہ یہ کہ نیت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

مگر یہی بات روح (spirit) کی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں کہتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین تو باعتبار نیت اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نمازی اللہ رب العالمین کی حمد میں سرشار ہے، اور اس کی یہ سرشاری لفظوں کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔

سورہ فاتحہ کے معانی پر غور کیجیے۔ اس سورہ کی سات آیتوں میں پوری ایمانی زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس میں رب العالمین کی نعمتوں پر شکر کا بیان ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اللہ قیامت میں سب کے اعمال کی بنیاد پر ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بندے کے اندر عبادت اور استعانت کی اسپرٹ موجزن ہونا چاہیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت کو دینے والا صرف اللہ ہے، اور انسان کو اسی سے ہدایت کا طالب ہونا چاہیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت پانے والے لوگ اس دنیا میں انعام یافتہ ہیں۔ اور جن کو اللہ کی طرف سے ہدایت کی توفیق نہ ملے، ایسے لوگ وہ ہیں جو اللہ کے غضب کا مستحق قرار پائے۔

یہ وہ تعلیمات ہیں جو سورہ فاتحہ میں دی گئی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب (مسند احمد، حدیث نمبر: 22671)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچا نمازی وہ ہے جس کے اندر سورہ فاتحہ کی یہ روح پائی جائے۔ نمازی کو چاہیے کہ وہ اسی روح فاتحہ کے ساتھ نماز ادا کرے۔ جو نماز اس روح فاتحہ سے خالی ہو وہ نماز، نماز نہیں۔

نعمت کی تحدیث

قرآن کی سورہ نمبر 93 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے کچھ ربانی عطیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ کے آخر میں یہ آیت ہے: وَأَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ (الضحیٰ:11) یعنی تم اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے رب سے ملی ہوئی نعمتوں کو دعوت کا موضوع بناؤ۔ خدا کی نعمت کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر لوگوں کے سامنے دعوت الی اللہ کا چرچا کرو۔ انفرادی (particular) واقعے کو جنرلائز (generalize) کرکے اس کو سب کے لئے سبق کا ذریعہ بنادو۔

اس معاملے کی مزید وضاحت کی جائے تو کائناتی سطح پر ملی نعمتیں بھی اس میں شامل ہوجائیں گی۔ جب ایک شخص صبح کے وقت سورج کو نکلتا ہوا دیکھے تو اس کو نعمتِ الٰہی کا ایک عجیب احساس ہوگا۔ جب وہ تازہ ہوا میں سانس لے اور آکسیجن جیسی نعمت کو اپنے اندر داخل کرے تو اس کو اللہ کی ایک انوکھی نعمت کا تجربہ ہوگا۔ ایک شخص جب پانی کا گلاس ہاتھ میں لے، اور اس کو پی کر اپنی پیاس بجھائے تو اللہ کی ایک انوکھی نعمت کی دریافت کرے گا۔ ان ربانی نعمتوں کو دریافت کرنا اور ان کو دعوت کا موضوع بنانا، یہی تحدیث نعمت ہے۔

نعمت کی تحدیث کا مطلب ہے، نعمت کی چرچا کرنا۔ مگر یہ سادہ بات نہیں۔ تحدیثِ نعمت سے پہلے نعمت کی معرفت ہے، اور نعمت کی معرفت سے پہلے اس کے بارے میں غوروفکر کرنا ہے۔ غوروفکر سے پہلے سنجیدگی کی شرط ہے۔ آدمی پہلے سنجیدہ بنتا ہے، اس کے بعد وہ حقیقتوں پر غور کرتا ہے، اس کے بعد اس کو خالق کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس کا سینہ نعمتوں پر شکر سے بھر جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی دوسروں سے اس کا چرچا کرنا، دوسروں کو اپنے احساس میں شریک کرنا، دوسروں کو خالق کی معرفت میں جینے والا بنانا، دوسروں کو اس قابل بنانا کہ وہ آخرت میں جنت کا مستحق قرار پائے۔

محبت کا معاملہ

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: أحبوا الله لما يغذوكم من نِعَمِه وأحبوني بحب الله وأحبوا أهل بيتي لحبي (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3789)۔ یعنی اللہ سے محبت کرو، اس بنا پر کہ وہ تم کو اپنی نعمتوں سے غذا عطا کرتا ہے، اور مجھ سے محبت کرو اللہ سے محبت کی بنا پر، اور میرے اہل بیت سے محبت کرو میری وجہ سے۔ اس حدیث میں تین محبتوں کا ذکر ہے۔ پہلی محبت ہے اللہ کی نعمتوں کی بنا پر اللہ سے محبت کرنا۔ یہاں غذا صرف خوراک کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کے عطیات الٰہی کے معنی میں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو دریافت کرے۔ ان نعمتوں پر غور وفکر کرے۔ ان نعمتوں کی اہمیت کا بار بار چرچا کرے۔ اس طرح فطری طور پر ایسا ہوگا کہ اس کے اندر اللہ سے حُبّ شدید (strong affection) پیدا ہو جائے گا۔ انسان اللہ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ انسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اللہ کے عطیات کا گہرا اعتراف کرے۔ اسی گہرے اعتراف کا نام حُبّ الٰہی ہے۔

اللہ کے لیے پیغمبر سے محبت کرنا یہ ہے کہ پیغمبر کے اس معاملے کو گہرائی کے ساتھ دریافت کرنا کہ پیغمبر کے ذریعے ہم کو وہ ہدایت ملی جو ہم کسی اور طریقے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ دریافت جتنی زیادہ شدید ہوگی، اتنی ہی زیادہ آدمی کے اندر پیغمبر خدا کے ساتھ محبت پیدا ہو جائے گی۔

پیغمبر کے اہل بیت سے محبت اس لیے ہے کہ اہل بیت نے پیغمبر کے مشن میں مکمل طور پر ساتھ دیا۔ کسی تکلیف یا شکایت کو انھوں نے عذر نہیں بنایا۔ وہ یک طرفہ وفاداری کے ساتھ پیغمبر سے جڑے رہے۔

محبت کی یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ اللہ سے محبت کے بعد فطری طور پر پیغمبر سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پیغمبر سے محبت کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ پیغمبر کے اہل بیت سے آدمی کے اندر محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ آدمی یہ دریافت کرتا ہے کہ پیغمبر کو اپنے مشن میں طرح طرح کے مشکل حالات پیش آئے، مگر اہل بیت کے تعلق میں کوئی کمی نہیں آئی۔

انسان کی تخلیق

انسان ایک بہترین مخلوق کی حیثیت سے دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس کو مختلف قسم کے مسائل پیش آتے ہیں — نقصان، بیماری، حادثات، بڑھاپا اور آخر میں موت۔ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے، وہ اگر اس کا حق (right) ہو تو کبھی اس کو زوال یا محرومی کا تجربہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے، وہ بطور حق نہیں ملتا۔ پھر اس پانے، اور بظاہر کھونے کی توجیہہ کیا ہے۔

قرآن کے مطابق، یہ پانا بطور ابتلاء (test) ہوتا ہے، یعنی مختلف احوال میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ لوگوں میں احسن العمل (67:2) کون ہے۔ یعنی وہ کون شخص ہے، جو اپنے ذہن کو اتنا بیدار کرے کہ وہ خالق کی نظر میں رائٹ پرسن (right person) قرار پائے۔ اسی رائٹ پرسن کو قرآن میں ربانی انسان (3:79) کہا گیا ہے۔ آخر میں یہ ہوگا کہ پوری تاریخ سے ایسے افراد کو منتخب (select) کیا جائے گا، جنھوں نے اپنے عمل سے ربانی انسان ہونے کا ثبوت دیا۔

اس لحاظ سے انسانی زندگی کے دو دَور ہیں۔ پہلا دور، عارضی مدت کا دور، دوسرا دور ابدی حیات کا دور۔ پہلے دور میں جو افراد کوالیفائی کریں گے، وہ ابدی دورِ حیات کے لئے منتخب کیے جائیں گے، اور جو لوگ کوالیفائی نہیں کریں گے، خالق کی عدالت میں ان کا انجام وہ ہوگا، جس کو بائبل میں الفضۃ المرفوضہ (rejected silver) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد منتخب افراد پر مبنی معاشرہ بنے گا، جہاں وہ ابدی طور پر جنتی ماحول میں زندگی گزاریں گے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت کے ابدی معاشرہ میں جگہ پانے والے لوگ کہیں گے: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (35:34)۔ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔ یہ جملہ انسان کی پوری زندگی کا خلاصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حزَن پہلے دورِ حیات کا ظاہرہ ہے۔ دوسرا دورِ حیات وہ ہے جو ہر قسم کے حزَن سے مکمل طور پر خالی ہوگا۔ اسی دوسرے دورِ حیات کا نام جنت ہے۔

غم کے بجائے دعا

قرآن میں ایک پیغمبر کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ انھوں نے مصیبت کے وقت کہا: إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ (12:86) یعنی پیغمبر نے کہا، میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔ پیغمبر کا یہ اسوہ بتاتا ہے کہ مومن کے لیے مصیبت کے وقت صحیح رویہ کیا ہے۔ یہ کہ وہ مصیبت کے وقت غم کرنے کے بجائے دعا کرے، وہ مسئلہ کو اللہ کے خانے میں ڈال دے۔

یہ ایک حکمت کی بات ہے۔ مسئلہ کو اپنے اوپر لینے سے غم کا مزاج بنتا ہے۔ اس کے برعکس، جب مسئلہ کو اللہ رب العالمین کے حوالے کر دیا جائے تو اس وقت آدمی کے اندر وہ نفسیات پیدا ہوتی ہے، جس کو ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے — میں نے اپنے معاملے کو تیرے حوالے کر دیا تو ہی اس معاملے کے پہلوؤں کو بہتر جانتا ہے:

سپردم بتو مایۂ خویش را　　　　تو دانی حسابِ کم وبیش را

اس فارمولے کو غم کرنے کے بجائے دعا کرنا کہا جا سکتا ہے۔ یہ بلاشبہ کسی شخص کے لیے زندگی کا سب سے اچھا اصول ہے۔ اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے، جو اس کو غمگین بنا دینے والے ہوں۔ ایسے حالات میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ یا شکایت کرتے ہیں، یا غم کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے کا سب سے اچھا حل یہ ہے کہ مسئلے کو اپنے اوپر نہ لیا جائے، بلکہ اللہ رب العالمین کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح کے معاملے میں آدمی کے بس میں صرف افسوس ہے، مگر اللہ رب العالمین سارے معاملات پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ وہ معاملات کو جس طرح چاہے کنٹرول کرے۔ وہ حالات کو دعا کرنے والے کے موافق بنا دے۔ ایسی حالت میں یہی روش حقیقت پسندانہ روش ہے کہ معاملے کو اپنے اوپر لینے کے بجائے، اس کو اللہ رب العالمین کے حوالے کر دیا جائے۔

تاریخ کا نیا دور

اسلام ساتویں صدی عیسوی میں آیا۔ اہل اسلام کی جدو جہد کے نتیجے میں اب دنیا میں ایک انقلاب آچکا ہے۔ روایات میں اس انقلاب کی پیشین گوئی موجود ہے۔ایک روایت کے مطابق پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا ھجرۃ بعد الفتح(صحیح البخاری، حدیث نمبر 2783)۔اس حدیث میں ہجرت اور فتح کے الفاظ صرف وقتی معنی میں نہیں ہیں، بلکہ وہ دور(age) کے معنی میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد دنیا میں ایک نیا دور آئے گا، اب ساتویں صدی کے ماڈل پر کام نہیں ہوگا۔یعنی اب دعوت، ہجرت، جہاد کا ماڈل عملاً غیر متعلق ہوگیا ہے۔اب وہ حالات بدل چکے ہیں جس میں ہجرت اور قتال پیش آیا تھا۔اب صرف زمانے کی رعایت کے مطابق دعوت الی اللہ کا پرامن کام کرنا ہوگا۔بقیہ نتائج اپنے آپ حاصل ہوتے رہیں گے۔

اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے کہ کسریٰ ہلاک ہوگیا اب کوئی کسریٰ نہیں، اور قیصر ہلاک ہوگیا اب کوئی قیصر نہیں(صحیح البخاری، حدیث نمبر 3120)۔اس میں بھی کسریٰ اور قیصر کے الفاظ علامتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہنشاہیت کا دور(age of imperialism)ختم ہوگیا۔اب دنیا میں دوبارہ شہنشاہیت کا دور آنے والا نہیں۔

اس حدیثِ رسول میں پیشین گوئی کی زبان میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے بعد دنیا سے بادشاہت اور شہنشاہیت کا دور ختم ہوجائے گا۔قدیم زمانے میں بادشاہی نظام اور شہنشاہی نظام کی بنا پر دینی تحریک کو حکومتی نظام کی طرف سے ایذا رسانی (persecution) کا معاملہ پیش آتا تھا۔ اب دینی تحریک کے لیے ایسا معاملہ پیش آنے والا نہیں۔ اب دینی تحریک کی منصوبہ بندی خالص غیر سیاسی بنیاد پر ہوگی۔ اب دینی تحریک کو شروع سے آخر تک امن کے حالات میں کام کرنے کا موقع ملے گا نہ کہ تشدد کے حالات میں، اب قیامت تک کسی تحریک کے لیے تشدد کے حالات پیش آنے والے نہیں۔

نبی امی

اُمی ہونے کا مطلب لوگ unlettered لیتے ہیں۔ مگر یہ ناکافی ہے۔ رسول اللہ کے بارے میں آتا ہے: کان طویل الصمت (مسند احمد: 20810)۔ یعنی آپ دیر تک چپ رہتے تھے۔ مگر یہ چپ رہنا صرف چپ رہنا نہیں تھا۔ کیوں کہ ایک حدیث میں ہے کہ مجھ کو 9 باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ہے: أن یکون صمتي فکراً (جامع الاصول: 9317)۔ یعنی میری خاموشی سوچنا ہو۔ اسی طرح ایک صحابی آپ کے بارے میں کہتے ہیں: متواصل الاحزان دائم الفکرۃ (المعجم الکبیر: 414)۔ اسی طرح نبوت سے پہلے آپ کا معمول تھا کہ آپ غار حرا میں جاتے اور وہاں کئی دن تک ٹھہرتے۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ وہاں بھی آپ اپنا وقت غور وفکر میں گزارتے تھے۔ اس قسم کی روایتوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی (unlettered) اس معنی میں تھے کہ آپ لکھی ہوئی چیز پڑھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن آپ کا تدبر اور غور وفکر ہر وقت جاری رہتا تھا۔ تخلیقی فکر (creative thinking) کے اعتبار سے آپ اعلیٰ ترین سطح پر تھے۔

کتاب کے مطالعہ سے آپ کو انفارمیشن ملتی ہے۔ مگر غور وفکر کرنے سے تخلیقی فکر آتی ہے۔ غور وفکر کے ذریعہ آدمی معلومات کا تجربہ کرتا ہے۔ غور وفکر کے درمیان اس کی ذہنی صلاحیت ارتقا کرتی رہتی ہے۔ غور وفکر کے ذریعہ آدمی کا potential ان فولڈ (unfold) ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ پیغمبر اسلام منفی سوچ (negative thinking) سے پوری طرح محفوظ تھے۔ یہ صفت بھی آپ کے لئے ذہنی ارتقا کا ذریعہ تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ مجھے قرآن دیا گیا ومثلہ معہ (مسند احمد: 17174)۔ یہ قرآن کے ساتھ مثل قرآن کیا ہے۔ یہ تدبر اور تفکر کے ذریعہ ذہنی ارتقا ہے۔ رسول اللہ کا کیس، ریموٹ کنٹرول کا کیس نہیں تھا۔ رسول کا امی ہونا بھی ایک سنت ہے۔ یعنی مطالعہ کتاب کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اپنا ذہنی ارتقا کرنا۔ مطالعہ کتب سے آدمی اگر ایک فی صد جانتا ہے تو تدبر اور تفکر کے ذریعہ 99 فی صد۔ امّی پلس ہونا ایک پازیٹیو کوالٹی (positive quality) ہے۔

واما السائل فلا تنہر

قرآن کی سورہ نمبر 93 میں یہ آیت آئی ہے: وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ: 11-10)۔ اس آیت میں سائل کا لفظ آیا ہے۔سائل کے معنی ہیں سوال کرنے والا۔ یہاں سائل سے مراد پیسہ مانگنے والا نہیں ہے۔ بلکہ سائل سے مراد وہ شخص ہے جو سچائی کے بارے میں دریافت کرے۔ یہاں سائل سے مراد وہ انسان ہے جس کو متلاشی (seeker) کہا جاتا ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا کہ اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو۔ یہ آیت سائل کے مطلب کو واضح کردیتی ہے۔اس کا مطلب یہ کہ طالب حق سے پوری خیر خواہی کے ساتھ ملو۔طالب حق کے ساتھ ہمدردی کا طریقہ اختیار کرو۔طالب حق کو دین کی تعلیم اور دین کی حکمت بیان کرو۔طالب حق سے اس انداز میں گفتگو کرو جو اس کے ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔قرآن کی یہ آیت حکیمانہ دعوت کی اہمیت کو بتاتی ہے۔

جب کوئی حق کا متلاشی آپ کے پاس آئے تو وہ ایسے سوالات کرسکتا ہے، جو آپ کے لیے نامانوس سوالات ہوں۔ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ سائل کی بات سنجیدگی کے ساتھ سنے اور خیر خواہی کے ساتھ اس کا جواب دے۔ وہ سائل کو حقیر نہ سمجھے، وہ سائل کے ساتھ رحم دلی کا سلوک کرے۔اور اگر وہ خود جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تو وہ اس کو مشورہ دے کہ تم فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کرو۔اسی کے ساتھ آدمی کو چاہیے کہ وہ خود سائل کے لیے دعا کرے۔اور سائل کو بھی بتائے کہ سوال کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ آدمی ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کرے۔

اگر آپ کے پاس سچائی ہے تو وہ آپ کے پاس اللہ کی امانت ہے۔آپ کی ذمے داری ہے کہ آپ اس امانت کو اللہ کے بندوں تک پہنچائیں۔آپ کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ آپ سائل کو کچھ نہ کچھ جواب دے دیں۔ بلکہ آپ کا جواب ایسا ہونا چاہیے جو سائل کے ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔سوال کرنا بھی ذمے داری ہے، اور سوال کا جواب دینا بھی ذمے داری ہے۔

آخرت پر ایمان

آخرت کا عقیدہ، اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ آخرت پر عقیدہ کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ کوئی شخص یہ کہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں، میں رسول کو مانتا ہوں، لیکن میں آخرت کے عقیدے کو نہیں مانتا تو ایسے شخص کو مومن اور مسلم قرار نہیں دیا جائے گا۔

آخرت کا عقیدہ صرف لفظی اقرار کا نام نہیں ہے۔ آخرت کا عقیدہ ایک زندہ یقین کا نام ہے۔ آخرت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان نے زندگی کی حقیقت پر غور کیا۔ اس نے شعوری طور پر آخرت کی حقیقت کو دریافت کیا، اور پھر آخرت اس کے لئے اس کے زندہ ایمان (living faith) کا حصہ بن گئی۔ آخرت کا زندہ یقین اس پر اس طرح چھایا کہ اس کی زندگی ہر اعتبار سے آخرت رخی زندگی (Akhirat-oriented life) بن گئی۔ یہی وہ شخص ہے جو آخرت پر ایمان لانے والا ہے۔

آخرت پر عقیدے کا مطلب ہے — جسمانی اعتبار سے دنیا میں رہتے ہوئے، فکر کے اعتبار سے آخرت میں پہنچ جانا۔ دکھائی دینے والی دنیا میں رہتے ہوئے، نہ دکھائی دینے والی دنیا میں جینے والا بن جانا۔ موجودہ دنیا انسان کے لئے ایک معلوم دنیا ہے۔ یہاں رہتے ہوئے آدمی ہر لمحہ اس کو دیکھتا ہے، اس کا عملاً تجربہ کرتا ہے، وہ اس دنیا میں زندگی گزارتا ہے، اور سو کر صبح کو دوبارہ اسی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔ موجودہ دنیا ہر وقت اس کو اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔

ایسی حالت میں آخرت پر زندہ یقین صرف اس شخص کو حاصل ہوگا، جو اپنے آپ کو سوچ کی سطح پر اتنا زیادہ اٹھائے کہ وہ عملاً آخرت میں نہ رہتے ہوئے سوچ کی سطح پر آخرت میں پہنچ جائے، وہ ہر دن اپنی کنڈیشننگ کو توڑتا رہے، وہ ہر صبح وشام آخرت پر اپنے عقیدے کی تجدید کرتا رہے، وہ اپنے اندر تجریدی فکر (detached thinking) کی صلاحیت پیدا کرے۔ یہی وہ انسان ہے جو آخرت کا مومن قرار پائے گا، اور یہی وہ انسان ہے جس کے لئے آخرت میں ابدی جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

خدا کا عقیدہ

برٹش فلسفی برٹرینڈ رسل ایک غیر مذہبی (nonbeliever) انسان تھا۔ اسی طرح جرمن سائنس داں البرٹ آئنسٹائن ایک غیر مذہبی انسان تھا۔ مگر دونوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ منکر خدا (atheists) ہیں۔ دونوں نے کہا کہ ان کا کیس agnosticism کا کیس ہے۔ یعنی دونوں نے خدا کے وجود کا انکار نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ وہ اس معاملے میں اثباتی طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہی حال تمام غیر مذہبی لوگوں کا ہمیشہ رہا ہے۔

خدا کے وجود کے بارے میں ایک موقف وہ ہے جس کو غیر علمی موقف کہنا صحیح ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو صاف لفظوں میں خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا کیس یہ ہے کہ وہ علم کے حدود کو نہیں جانتے، اس لیے وہ اپنی خواہش کے مطابق کچھ بھی بولتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا قول علمی اعتبار سے قابل اعتبار نہیں ہے۔

دوسرا کیس ان لوگوں کا ہے جنھوں نے علوم کا مطالعہ کیا اور یہ جانا کہ انسانی علم کی حد کیا ہے۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ خدا ہم کو دکھائی نہیں دیتا تو وہ خدا کے وجود کے بارے میں شک میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے علمی ذوق کے بنا پر انکار کے الفاظ نہیں بولتے۔ وہ صرف یہ کہہ کر چپ ہوجاتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ خدا ہے یا نہیں۔

دونوں قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں: پہلی قسم کے لوگ بھی اور دوسری قسم کے لوگ بھی۔ پچھلے زمانے میں پہلی قسم کے لوگوں کو ملحد کہا جاتا تھا، اور دوسری قسم کے لوگوں کو لاادریہ۔ موجودہ زمانے میں پہلی قسم کے لوگوں کو اتھیسٹ (atheist) کہا جاتا ہے، اور دوسری قسم کے لوگوں کو اگناسٹک (agnostic) کہا جاتا ہے۔ اس موضوع کو تفصیلی طور پر سمجھنے کے لیے راقم الحروف کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، مذہب اور جدید چیلنج، اور اسلام اور عصر حاضر۔ ان کے علاوہ اظہار دین کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں مفید ہوگا۔

عاجلانہ اقدام، صابرانہ منصوبہ بندی

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التأني من الله، و العجلة من الشيطان (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر :4058)۔ یعنی غور وفکر کرنا اللہ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی کرنا شیطان کی طرف سے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معاملہ پیش آنے پر انسان تأنی کا طریقہ اختیار کرے، اور غور وفکر کرکے اپنی روش متعین کرے۔ تو وہ اللہ کی نصرت کے تحت ہوتا ہے، اور اگر وہ معاملہ پیش آنے کے وقت ردعمل کا طریقہ یا جلد بازی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کا عمل شیطان کے زیر اثر ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ طرح طرح کے معاملات پیش آتے ہیں۔ ایسی موقع پر انسان کے لیے رسپانس (response) کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے عاجلانہ اقدام کا طریقہ۔ ایسا طریقہ ہمیشہ نقصان کا سبب بنتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی پہلے ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سوچے، پھر حالات کا جائزہ لے کر اپنے عمل کا رخ متعین کرے۔ یہ صابرانہ منصوبہ بندی کا طریقہ ہے۔ اس طریقے میں انسان کو اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے، اور وہ کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔

آدمی کو اس کے خالق نے سوچنے کی صلاحیت دی ہے۔ آدمی سوچ کر کسی چیز کے لیے مثبت اور منفی پہلو کو جان سکتا ہے۔ وہ یہ معلوم کرسکتا ہے کہ کسی عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ جب کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ اپنے خداداد ذہن کو اپنی حالت پر قائم رکھے، وہ غیر متاثر ذہن کے ساتھ تمام پہلوؤں پر غور کرے تو یقیناً وہ جان لے گا کہ اس وقت مجھے کیا کرنا ہے، اور کیا نہیں کرنا ہے۔ ایسے آدمی کو اللہ کی مدد حاصل ہوگی، اور وہ اللہ کی مدد سے کامیاب ہوجائے گا۔

اس کے برعکس کیس اس انسان کا ہے، جس کے ساتھ کوئی ناموافق معاملہ پیش آئے تو وہ بھڑک اٹھے، وہ جذباتی ردعمل کے تحت جوابی کارروائی شروع کردے۔ ایسا آدمی کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اس کی کارروائی میں حالات کا اندازہ شامل نہ ہوگا۔ ایسے انسان کو فطرت کے نظام کی تائید حاصل نہ ہوگی۔

نصیحت کا صحیح طریقہ

ایک مسلم مجلہ (اپریل 2015) میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: عالم اسلام انتہاپسندی کے نرغے میں۔ اس مضمون میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ مذہب کے معاملے میں وہ انتہاپسندی (extremism) کو چھوڑ دیں۔ جس نے ماضی میں بھی مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے، اور آج بھی اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصانات ہو رہے ہیں۔

ایک طرف مجلّے میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی گئی تھی، دوسری طرف اسی مجلہ میں ایک اور مضمون کے تحت درج ہے: گستاخان یورپ گاہے گاہے کائنات کی سب سے عظیم وافضل ہستی کی شان اقدس میں گستاخی کی جسارت کرکے دنیامیں سب سے زیادہ بسنے والے مسلمانوں کی دل آزاری کرتے ہیں اور پھراس کو آزادئ اظہارِرائے کے نام سے جاری رکھنے پر اصرار بھی کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے کے علماء اوررہنماؤں کا عام مزاج یہی ہے۔ ایک طرف وہ بظاہر مسلمانوں کواسلام کے نام پر امن پسندی کی تلقین کریں گے، دوسری طرف وہ یہ کریں گے کہ جدید دور کے تقاضے کے تحت کوئی شخص اگراسلام کے موضوع پر کوئی اختلافی اظہاررائے کرے تو اس کو" پیغمبرِاقدس" کی شان میں ناروا گستاخی کہہ کر مسلمانوں کواپنے مذہب کے معاملے بے حد حساس (sensitive) بنائیں گے۔ حالاں کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دنیا میں خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق ہر انسان کوآزادی حاصل ہے۔ اس لیے اگرآپ مسلمانوں کوامن پسند بنانا چاہتے ہیں تو ان کو حساسیت کی خوراک دینا چھوڑ دیجیے، اوراگرآپ حساسیت کی خوراک دینانہیں چھوڑ سکتے تو مسلمانوں کو امن پسندی کی تلقین بھی مت کیجیے۔ کیوں کہ امن کا ماحول ہمیشہ صبروتحمل کی قیمت اداکرنے کے بعد قائم ہوتا ہے۔ جولوگ اختلافی معاملات میں صبرتحمل کی روش اختیار نہ کرسکیں، وہ اگر امن پسندی کی بات کہتے ہیں تو وہ قرآن کے الفاظ میں، ایک ایسے عمل کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، جس کوانھوں نے کیا ہی نہیں (3:188)۔

یہ ایک دوطرفہ رویہ ہے۔ اس دوطرفہ رویہ کے بارے میں قدیم یہود کو تنبیہ کرتے ہوئے قرآن میں یہ اعلان کیا گیا تھا: کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو (2:85)۔

قرآن کا یہ اعلان موجودہ زمانے کے مسلم علماء اور رہنماؤں پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ وہ ایک طرف اسلام کے نام پر مسلمانوں کو امن کی تلقین کریں گے، اسی کے ساتھ وہ دوسری قوموں کی زیادتیوں کا مبالغہ آمیز تذکرہ کرکے مسلمانوں کو مسلسل طور پر مشتعل کریں گے۔ اور جب اس کا منفی نتیجہ سامنے آئے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسا دوسری قوموں کی سازش کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ دوہرا روش قرآن کے مطابق لوگوں کو خدا کی پکڑ کا مستحق بناتی ہے، نہ کہ خدا کے انعام کا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان اپنی زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر ایک قوم پسند گروہ بن گئے ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق امت مسلمہ ایک داعی گروہ کا نام ہے لیکن دورِ زوال کے نتیجے میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا مزاج یہ بن گیا ہے — میری قوم، خواہ صحیح ہو یا غلط:

my community, right or wrong

مسلمانوں کے اندر اگر داعیانہ ذہن موجود ہو تو وہ دوسری قوموں کو اپنا مدعو سمجھیں گے، نہ کہ حریف اور رقیب۔ وہ یہ جانیں گے کہ مدعو قوم کے مقابلے میں داعی کی روش ردعمل پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ یک طرفہ صبر پر مبنی ہوتی ہے۔ داعی اگر مدعو کے مقابلے میں ردعمل کا طریقہ اختیار کرے تو قرآن کے الفاظ میں وہ رجز (74:5) کا طریقہ ہوگا، یعنی گندگی کا طریقہ (dirty practice)۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے اظہارِ اختلاف کو بطورِ خود رسول کی شان میں گستاخی کا عنوان دے رکھا ہے، یہ سرتاسر بے بنیاد بات ہے۔ مسلمانوں کے اندر اگر مثبت ذہن ہو تو وہ اظہارِ اختلاف کو تبادلۂ خیال (discussion) کا موضوع بنائیں گے۔ وہ ایسے لوگوں کے لیے مثبت انداز میں لٹریچر تیار کریں گے۔ وہ اظہارِ اختلاف کو دعوت کے مواقع میں تبدیل کردیں گے۔ یہ دنیا اس کے لیے ہے جو منفی تجربے کو مثبت فکر میں تبدیل کرسکے۔

آئڈیالوجی کی طاقت

عن ابن عباس. قال: لما مشوا إلى أبي طالب وكلموه- وهم أشراف قومه عتبة بن ربيعة، وشيبة بن ربيعة، وأبو جهل بن هشام، وأمية بن خلف، وأبو سفيان بن حرب، في رجال من أشرافهم- فقالوا: يا أبا طالب إنك منا حيث قد علمت، وقد حضرك ما ترى وتخوفنا عليك وقد علمت الذي بيننا وبين ابن أخيك فادعه فخذ لنا منه وخذله منا ليكف عنا ولنكف عنه، وليدعنا وديننا ولندعه ودينه. فبعث إليه أبو طالب فجاءه فقال: يا ابن أخي هؤلاء أشراف قومك قد اجتمعوا إليك ليعطوك وليأخذوا منك. قال فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا عم كلمة واحدة تعطونها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم. (البداية والنهاية: 3/123)

کچھ لوگوں نے اس حدیث کا یہ مطلب نکالا کہ اسلامی حکومت قائم کرو حالانکہ اس حدیث کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حدیث میں کلمہ کی بات کہی گئی ہے نہ کہ حکومت کی۔ کلمہ کا مطلب وہی ہے جس کو آج کل کی زبان میں ideology کہا جاتا ہے۔

اس حدیث میں دراصل آئڈیالوجی کی طاقت کو بتایا گیا ہے۔ قبائلی دور (tribal age) میں لوگ سمجھتے تھے کہ تلوار سب سے بڑی طاقت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ تمھاری یہ سوچ غلط ہے۔ تم کو آئڈیالوجی کی طاقت معلوم نہیں، اس لیے تم ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ اسلام کی آئڈیالوجی توحید کی آئڈیالوجی ہے۔ قدیم زمانے میں اسلام اپنی اسی آئڈیالوجی کی طاقت سے پھیلتا رہا۔ موجودہ زمانے میں جب کہ مسلمان اس احساس میں جی رہے ہیں کہ سیاسی خلافت ختم ہوگئی۔ مگر عین اسی وقت ساری دنیا میں اسلام اپنی آئڈیالوجی کے ذریعے پھیل رہا ہے۔ ہر جگہ لوگ اسلام کی آئڈیالوجی میں سچائی کو دریافت کرتے ہیں۔ اور پھر اسلام کے حلقہ میں شامل ہوجاتے ہیں۔ آئڈیالوجی انسان کو مسخر کرتی ہے، اور جب انسان مسخر ہوجائیں تو کوئی اور چیز تسخیر کے لیے باقی نہیں رہتی۔

دعوت کا اسلوب

ربیعہ بن عباد الدیلی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ کو ذوالمجاز کے سوق میں دیکھا۔ آپ لوگوں کے پاس جاتے اوران سے کہتے: یا أیہا الناس قولوا: لا إلہ إلا اللہ، تفلحوا (مسند احمد: 16023)۔اس روایت کو لے کر بعض لوگ کہتے ہیں کہ دعوت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے مل کر ان کو کلمہ پڑھنے کے لیے کہا جائے۔اس کے علاوہ دعوت کا کوئی اور اسلوب درست نہیں ہوسکتا۔

اگر دعوت کا یہی واحد اسلوب تھا تو قرآن میں یقینا اس کو بتایا گیا ہوتا۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ایسی کوئی ہدایت موجود نہیں۔ البتہ قرآن کے مطالعے سے اس سلسلے میں کئی اسلوب ملتے ہیں۔مثلاً یَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ (74:1-2)۔اسی طرح اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (5:66)۔خود احادیث سے بھی دوسرے اسالیب معلوم ہوتے ہیں۔مثلا ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: عرض علیہم الإسلام، وتلا علیہم القرآن (سیرت ابن ھشام: 1/428)، وغیرہ۔

اصولی طور پر دعوت کا صرف ایک اسلوب ہے، اور وہ قرآن کی ایک آیت میں اس طرح بتایا گیا ہے: قُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (4:63)۔یعنی ان سے ایسے اسلوب میں کلام کرو جوان کے ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔اس قرآنی ہدایت کے مطابق ظاہری اعتبار سے دعوت کے مختلف اسلوب ہوسکتے ہیں۔اسلوب ہمیشہ مخاطب کے اعتبار سے متعین ہوگا۔پہلے مخاطب کا مطالعہ کیا جائے گا، اور پھر اس کے ذہن کے اعتبار سے ایسا اسلوب اختیار کیا جائے گا جو اس کے ذہن کو اپیل کرنے والا ہو۔

دعوت کا نشانہ یہ ہے کہ مدعو کے اوپر اتمام حجت ہوجائے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165)۔ حجت کبھی کسی قسم کے مقرر الفاظ کی ادائیگی سے نہیں ہوتی۔ حجت کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مدعو کے ذہن کی رعایت کی گئی ہو۔حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا اسلوب مدعو کے اعتبار سے متعین ہوگا، نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔

دین میں استقامت

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَكَأَيِّن مِن نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (آل عمران: 146) اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ ہوکر بہت سے اللہ والوں نے قتال کیا۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں، ان سے نہ وہ پست ہمت ہوئے، نہ انھوں نے کمزوری دکھائی۔ اور نہ وہ دبے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

قرآن میں کہیں بھی پیغمبر اسلام کے علاوہ کسی اور نبی کے قتال کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یہاں قتال کو لفظی معنی میں لینا درست نہ ہوگا۔ ہر زبان میں یہ اسلوب ہے کہ شدید جدوجہد کے لیے جنگ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی۔

مشہور عربی لغت لسان العرب میں قرآن وحدیث سے متعدد مثالیں پیش کرنے کے بعد بتایا ہے کہ قتال ہمیشہ جنگ کے معنی میں نہیں آتا (وليس كل قتال بمعنى القتل)۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو لسان العرب، طبعہ بیروت 11/549۔

مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کے اوپر جو مصیبتیں پڑیں، ان پر وہ نہ وہن میں مبتلا ہوئے، نہ ضعف میں اور نہ استکانت میں۔ یہ تینوں الفاظ تقریباً ہم معنی ہیں۔ یعنی انھوں نے مصیبت کے وقت کمزوری نہیں دکھائی۔ زبان کا یہ اسلوب ہے کہ تاکید کے لیے ہم معنی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ صبر وتحمل اور برداشت کا طریقہ اختیار کرو۔

اللہ کی پسند والی زندگی اختیار کرنا ہمیشہ طرح طرح کے مسائل کا سبب بنتا ہے۔ یہ مسائل کبھی آدمی کو پست ہمت بنا دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پست ہمتی سے بچائے، اور اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ وہ مسائل کو اللہ کے خانے میں ڈال دے، اور دعاؤں کے سائے میں اپنی زندگی گزارتا رہے۔

دورِ فتنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشین گوئی یہ فرمایا تھا کہ بعد کے زمانے میں امت میں فتنہ (اختلاف و جنگ) کا دور آئے گا۔ اس وقت مخلص اہل ایمان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کے بارے میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: يوشك أن يكون خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر، يفر بدينه من الفتن (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7088)۔ یعنی قریب ہے کہ وہ وقت آئے جب کہ مومن کا سب سے اچھا مال بکریاں ہوں جن کو لے کر وہ پہاڑوں کے اوپر چلا جائے، اور گوشہ کے مقامات میں چلا جائے۔ اور وہاں اپنے کو فتنے سے بچالے۔

اس حدیث میں غنم کا لفظ علامتی طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب امت میں اختلاف بڑھ جائے، اور لوگوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوجائے تو سچے صاحب ایمان کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے لیے کوئی ایسا گوشہ حیات تلاش کرلے، جہاں وہ اختلاف وٹکراؤ سے دور رہ کر زندگی گزارے اور اسی حال میں مرجائے۔

اختلاف اگر مثبت اختلاف کے معنی میں ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جب اختلاف کی صورت یہ ہو کہ لوگ ایک دوسرے کی نیت پر حملہ کرنے لگیں، اس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوجائے، حتی کہ جنگ وقتال کی نوبت آجائے تو بلاشبہ وہ برا ہے۔ اس وقت کسی شخص کے لیے نجات کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو باہمی ٹکراؤ سے الگ تھلگ کرلے، وہ ذاتی اصلاح کے دائرے میں اپنے کو سمیٹ لے۔

حدیث میں آیا ہے: اختلاف امتي رحمة (المقاصد الحسنة: 39)۔ اس اختلاف سے وہ اختلاف مراد ہے، جو خیر خواہانہ جذبے کے ساتھ تبادلۂ خیال (discussion) کے ہم معنی ہو۔ لیکن وہ اختلاف جو مبنی برعناد ہو، جس کا مقصد دوسرے کو نیچا دکھانا ہو، جس میں الزام تراشی کی زبان استعمال کی جائے، ایسا اختلاف بلاشبہ گناہ ہے اور وہ قابل ترک ہے۔

اعتدال کا مطلب

ایک روایت کافی مشہور ہے۔ یہ روایت صحاح ستہ میں موجود نہیں، البتہ وہ دوسری کتب حدیث میں پائی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: خیرُ الأمورِ أوساطُها (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 7176)۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: خیرُ الأمورِ أوسَطُها (جامع الاصول: 10/130)۔ یعنی معاملات میں بہتر طریقہ درمیانی طریقہ (middle path) ہے۔

اس روایت میں خیر الامور کا لفظ ہے، لیکن اکثر لوگوں نے اس کی توسیع کرکے اس کو خیر الافکار کے معنی میں لے لیا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ یہ روایت عملی معاملات کے لیے ہے، وہ فکری معاملات کے لیے نہیں۔ مثلاً نفل نمازوں یا نفل روزوں کے بارے میں کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو اس سے کہا جائے کہ تم درمیانی طریقہ یا اعتدال کا طریقہ اختیار کرو، نہ بہت کم نہ بہت زیادہ۔ اسی طرح انفاق کے معاملے میں کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو اس سے بھی یہی کہا جائے گا کہ اعتدال کے ساتھ انفاق کرو۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومًا مَّحۡسُورًا (17:29)۔ مگر افکار کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ افکار کے معاملے میں یہ دیکھا جائے گا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں کون سا فکری موقف صحیح ہے اور کون سا فکری موقف غلط۔ مثلاً متطرفین (extremists) اور غیر متطرفین کے درمیان کوئی بیچ کا راستہ یا مسلک اعتدال نہیں ہوتا۔ یہاں یہ بتانا پڑتا ہے کہ دونوں میں سے کون سا گروہ صحیح ہے اور کون سا گروہ غلط۔ فکری معاملے میں قرآن کا اصول یہ ہے کہ حق کے بعد جو چیز ہے وہ ضلالت ہے: فَمَاذَا بَعۡدَ ٱلۡحَقِّ إِلَّا ٱلضَّلَٰلُ (10:32)۔

اصل یہ ہے کہ عملی معاملات میں اعتدال کا طریقہ حکمت کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس فکری معاملات میں اعتدال کا طریقہ شبہ نفاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ فکری معاملات میں وضوح (clarity)، اور یقین (conviction) مطلوب ہوتا ہے۔ اگر اعتدال کے طریقے کو فکر تک وسیع کیا جائے تو لوگوں کے ذہنوں میں یقین بھی ختم ہو جائے گا، اور وضوح بھی۔

ایک اجتماعی اصول

قرآن کی سورہ نمبر 4 میں ایک اجتماعی حکم کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ (النساء: 83)

اس آیت کا ابتدائی مفہوم یہ ہے کہ جنگ اور امن کے حالات کا تعلق حکومت کے ذمہ داروں سے ہوتا ہے، اس لیے اس نوعیت کی کوئی بات ہو تو لوگوں کو چاہیے کہ اس کو حکومت کے ذمہ داروں تک پہنچائیں، تا کہ وہ اس کے بارے میں صحیح کارروائی کر سکیں۔

قرآن کی اس آیت سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخص کو کسی معاملے سے متعلق کوئی بات کہنا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ بات کو اس سے کہے جس کا اس معاملے سے تعلق ہے۔ متعلق اشخاص سے بات کہنا سماج میں اصلاح پیدا کرتا ہے۔ اور بات کو غیر متعلق اشخاص سے کہنا سماج میں فساد پھیلانے کا سبب بنتا ہے۔

خاص طور پر جب کوئی منفی بات یا شکایت کی بات ہو تو ایسی بات کو غیر متعلق اشخاص سے بیان کرنا نہایت بری عادت ہے۔ کسی آدمی کے پاس اگر ایسی کوئی بات ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے دل میں رکھے اور سب سے پہلے متعلق شخص سے مل کر اس کی وضاحت معلوم کرے۔ یہی طریقہ صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

سماج میں اکثر خرابیاں بات سے پیدا ہوتی ہیں۔ لوگوں کا عام مزاج یہ ہے کہ جب ان کو کوئی بری بات معلوم ہو تو وہ فوراً اس کا چرچا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ چرچا عام طور پر غیر متعلق اشخاص کے درمیان کیا جاتا ہے۔ متعلق شخص سے سنجیدہ انداز میں گفتگو کرنا ہی اس معاملے میں واحد صحیح طریقہ ہے۔

فساد کی برائی

قرآن میں ایک اجتماعی برائی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (2:205)۔ اور جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتوں اور نسل کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انسان یا کوئی گروہ اگر سماج میں ایسی سرگرمی جاری کرے جس کے نتیجے میں لوگ قتل کیے جائیں اور لوگوں کی معاشیات تباہ ہوں تو یہ ایک ایسا فعل ہے جو اللہ کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہے۔ ایسی کسی سرگرمی پر اللہ کی مدد نہیں آسکتی۔ ایسی سرگرمی کرنے والے لوگ اللہ کے غضب کے مستحق ہیں، ان کو اللہ کی مدد ہرگز ملنے والی نہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں تباہی کی تاریخ بنائیں گے نہ کہ تعمیر کی تاریخ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اجتماعی سرگرمی میں صحیح اور غلط کا معیار کیا ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں وہی سرگرمی درست ہے، جو سماج میں مثبت قدروں (positive values) کو فروغ دے، جس سے لوگوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہوں، جس سے سماج کے ہر طبقے کو فائدہ پہنچے۔ اس کے برعکس، جو سماجی سرگرمی سماج کے اندر نفرت اور تشدد پیدا کرے، جس سے لوگوں کی معاشیات تباہ ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں۔ ایسی سرگرمی بلاشبہ اللہ کے نزدیک صرف برائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سماجی زندگی میں کسی سرگرمی کا معیار، اس کا نتیجہ (result) ہے۔ لیڈر کے اوپر فرض ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ اس کی سرگرمی سے برا نتیجہ نکل رہا ہے، لوگوں کی معاشیات تباہ ہورہی ہیں، اور لوگ قتل کیے جارہے ہیں، تو فوراً اس کو اعلان کرنا چاہیے کہ ہماری سرگرمی اللہ کی ناراضگی کا سبب بن رہی ہے۔ ہم اس کو فوراً ختم کرتے ہیں، اور اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ ہماری غلطی کے لیے ہم کو معاف فرمائے۔

علمِ معرفت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: عن علي بن أبي طالب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الإيمان معرفة بالقلب، وقول باللسان، وعمل بالأركان (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 65)۔ یعنی علی ابن ابی طالب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایمان قلبی معرفت کا نام ہے، اور زبان سے اقرار کا، اور ارکان پر عمل کرنے کا۔

جس طرح بیج سے پورا درخت نکلتا ہے، یہی معاملہ اسلام کا ہے۔ اسلام کا آغاز معرفت (realization of God) سے ہوتا ہے۔ معرفت جب آدمی کے شعور کا حصہ بن جاتی ہے، تو اسی کا نام ایمان ہے۔ معرفت جب یقین (conviction) بن کر آدمی کی زبان پر جاری ہوجائے تو اسی کا نام لسانی اقرار ہے۔ معرفت جب آدمی کے عمل میں ڈھل جائے تو اسی کا نام ارکانِ دین کی عملی پیروی کرنا ہے۔ جس طرح بیج کے اندر پورا درخت ہوتا ہے، اسی طرح معرفت کے اندر پورا اسلام موجود ہوتا ہے۔

معرفت ابتدائی طور پر انسان کے لاشعور (unconscious mind) میں موجود ہوتی ہے۔ پھر آدمی جب غور وفکر کرتا ہے تو معرفت ان فولڈ (unfold) ہونے لگتی ہے۔ قرآن میں تدبر اور کائنات میں غور وفکر کے ذریعے معرفت اپنے ارتقائی درجے تک پہنچتی ہے۔ اسلام کی بعد کی تاریخ میں معرفت کا تصور حذف ہوگیا۔ علم کلام بظاہر معرفت کا علم تھا، لیکن متکلمین نے علم کلام کو یونانیات پر مبنی کر دیا۔ اس لیے علم کلام حقیقی معنوں میں معرفت کا علم نہ بن سکا۔ صوفیا نے بظاہر معرفت کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن انھوں نے یہ غلطی کی کہ معرفت کو تدبر (contemplation) یعنی عقلی غور وفکر پر مبنی قرار نہیں دیا، بلکہ انھوں نے مراقبہ (meditation) کو معرفت کا سرچشمہ سمجھ لیا۔ یعنی جو چیز عقل کے ذریعے ملنے والی تھی، اس کو دل (heart) میں تلاش کرنے لگے۔ معرفت دل کے اندر موجود ہی نہ تھی، اس لیے صوفیا کو حقیقی معرفت نہیں ملی۔ اس طرح متکلمین بھی معرفت سے محروم ہوگیے اور صوفیا بھی۔ یہی معاملہ فقہ کے ساتھ پیش آیا جو معرفت کے بجائے ظواہرِ احکام کا موضوع بن کر رہ گئی۔

ایمان اور عمل

علماء کے درمیان قدیم زمانے سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ ایمان میں عمل داخل ہے یا نہیں۔ پچھلی صدیوں میں اِس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک غیر متعلق بحث ہے۔ اِس بحث کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بحث ایک حدیثِ رسول کی بنا پر پیدا ہوئی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے: مَن قال لا إله إلا الله، دخل الجنة (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 151)۔

اِس حدیث کے ظاہر کو لے کر یہ رائے قائم کرلی گئی کہ قول یا زبان سے کلمہ پڑھنے کا نام ایمان ہے، اور جو شخص زبان سے کلمہ پڑھ لے، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ ایک اساسی معاملہ ہے۔ ایمان کے معاملے میں صحیح رائے وہی ہے جو دوسری آیتوں اور حدیثوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہو۔ اِس حیثیت سے جب ایمان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے بیج (seed) کی مانند ہے۔ جس طرح ایک بیج کے اندر پورا درخت امکانی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے اندر پورا اسلامی عمل بھی امکانی طور پر موجود ہوتا ہے۔

ایمان کا بیج پورا درخت کس طرح بنتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ تدبر اور تفکر کے ذریعے۔ مومن وہ ہے جو معرفت کا حریص ہو۔ جو قرآن وسنت کا مطالعہ کرے، جو خدا کی تخلیق میں مسلسل طور پر غور کرے۔ جو شخص اس طرح کی مومنانہ زندگی اختیار کرتا ہے، اس کا ایمان درخت کی مانند ہر وقت بڑھتا رہتا ہے۔ اس طرح کا عمل اس کے ایمان کو ایک تخلیقی ایمان (creative faith) بنا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دن اس کی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر دن اس کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے، ہر دن اس کے تعلق باللہ میں اضافہ ہوتا ہے، ہر دن اس کے تزکیہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ اضافہ مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس عمل کو روک دے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی انسان کی عملی زندگی میں اس کا اظہار ہوگا۔

ایک سنتِ رسول

ایک صاحب جو ایک ٹاؤن میں رہتے ہیں، وہ دہلی آکر مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کے مشن سے اتفاق کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے مقام پر چلیں، وہاں دو دن ٹھہریں۔ ہم وہاں آپ کی تقریر کرائیں گے، اس کے علاوہ لوگ آپ سے ملاقات کریں گے اور ہمارے یہاں کام بڑھے گا۔

میں نے کہا کہ روایتی طور پر آپ لوگ کام کا ایک ہی پیٹرن جانتے ہیں، اور وہ ہے کسی عالم یا کسی بزرگ کو اپنے یہاں لے جانا، اور چند دن ان کو اپنے مقام پر ٹھہرا کر تقریر اور ملاقات کا پروگرام بنانا۔ عام زبان میں اس کو دورہ کہا جاتا ہے۔ مگر زیادہ مفید بات یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ اس معاملے میں ایک سنت رسول کو زندہ کریں۔ پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ کی زندگی کے واقعات، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان میں جو پیٹرن ملتا ہے وہ دورہ والا پیٹرن نہیں ہے۔ اس کا پیٹرن یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ کے پاس آتا ہے، وہ آپ کی باتیں سنتا ہے اور قرآن کو سن کر اس کو یاد کرلیتا ہے۔ پھر وہ اپنے مقام پر واپس جاتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کو وہ قرآن سناتا ہے اور رسول اللہ سے سیکھی ہوئی باتوں کو بتاتا ہے۔

اسی پیٹرن سے اس زمانہ میں رسول اللہ کا مشن پورے عرب میں پھیل گیا۔ دعوت کے اس پیٹرن کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہلِ ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا، تاکہ وہ دین میں گہری سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔ (9:122)

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ ہے۔ اِس زمانہ میں اس پیٹرن کو زیادہ بڑے پیمانہ پر استعمال کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ آپ اس پیٹرن کی اہمیت کو سمجھئے اور اس کے مطابق کام کیجئے۔ پھر میں نے کہا کہ ہم اس پیٹرن کو موجودہ زمانہ میں زندہ کر رہے ہیں۔ ہم قرآن کا ترجمہ مختلف

زبانوں میں تیار کرکے چھاپ رہے ہیں۔ آپ قرآن کے ان ترجموں کو ہر جگہ لوگوں کے درمیان پھیلائیے۔ اس کے علاوہ ہم نے جدید ضرورت کے مطابق بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں تیار کی ہیں۔ یہ گویا سپورٹنگ لٹریچر ہے۔ آپ ان مطبوعہ کتابوں کو ہر جگہ آسانی کے ساتھ پھیلا سکتے ہیں۔ یہی دعوت کا پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ اس طریقہ کو استعمال کرکے آپ مشن میں اپنا حصہ ادا کرسکتے ہیں۔

اس پیغمبرانہ طریقے میں مزید بہت سے فائدے ہیں۔ ایک بڑا فائدہ وہ ہے جس کو ذاتی شرکت (personal involvement) کہا جاسکتا ہے۔ اس طریقے میں یہ ہوگا کہ آپ منصوبہ بندی (planning) کریں گے۔ آپ لوگوں سے ملیں گے۔ لوگوں کے ساتھ آپ کا انٹرایکشن ہوگا۔ آپ کو نئے نئے تجربات پیش آئیں گے۔ آپ کی دعوہ اسپرٹ میں اضافہ ہوگا۔ لوگوں کے ساتھ آپ کا تعلق بڑھے گا۔ آپ حالات سے باخبر ہوتے چلے جائیں گے۔ آپ کا دعوتی کام تنظیم (organization) کی صورت اختیار کرلے گا۔

اس طریقے میں بہت زیادہ فائدے ہیں۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ آپ کو مختلف قسم کے تجربات پیش آتے ہیں جو آپ کی تربیت کا ذریعہ ہیں۔ آپ کے ساتھ ایسے مواقع پیش آتے ہیں جو آپ کے اندر دعوت کی کیفیت کو ابھارتے ہیں۔ حالات کے تقاضے کے تحت، آپ محسوس کرتے ہیں کہ مجھے اپنا مطالعہ بڑھانا چاہیے۔ اس عمل کے دوران، آپ انسان کی رعایت کرنا سیکھتے ہیں۔ آپ جب ایک عالم یا ایک بزرگ کو بلا کر ان سے تقریر کرواتے ہیں تو وہ صرف ایک کام ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ مذکورہ پیغمبرانہ سنت پر عمل کریں تو آپ کا دعوتی کام ہزار پہلوؤں والا کام بن جائے گا۔

پیغمبرانہ سنت کے مطابق عمل کرنے سے آپ کے عمل کا فائدہ دگنا ہوجاتا ہے۔ وہ آپ کے لیے بھی مفید ہوتا ہے، اور مدعو کے لیے بھی۔ آپ کے لیے اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے آپ کے ذہنی ارتقا (intellectual development) میں اضافہ ہوتا ہے۔ مدعو کے لیے یہ فائدہ کہ وہ زیادہ بہتر طور پر مشن کے بارے میں واقفیت حاصل کرتا ہے، وہ زیادہ غور وفکر کے ساتھ مشن کے بارے اپنے رویے کا تعین کرتا ہے۔

امتیاز ابلیس کی سنت ہے

مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ اکثر یہ لکھتا اور بولتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز (discrimination) کا سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ بات سرتاسر خلافِ واقعہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ ابلیس کی سنت ہے۔ جو لوگ امتیاز کی بولی بولتے ہیں، وہ عملاً ابلیس کی پیروی کر رہے ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے جنات کو پیدا کیا گیا (15:27)۔ اس کے بعد اللہ نے انسان کو بنایا، اور یہ اعلان کیا کہ انسان زمین میں خلیفہ ہوگا۔ اس پر جنات کے سردار ابلیس نے اعتراض کیا کہ یہ امتیاز اور ناانصافی کا معاملہ ہے۔ کیوں کہ جنات کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے، اس لیے جنات کا درجہ بڑا ہے۔ ایسی حالت میں جنات کو نظر انداز کرکے آدم کو زمین کا خلیفہ بنانا امتیاز اور ناانصافی کا معاملہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امتیاز (discrimination) کچھ لوگوں کا خود ساختہ لفظ ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے اس دنیا میں امتیاز کا کوئی وجود نہیں۔ جس چیز کو امتیاز کہا جاتا ہے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نااہلی (incompetence) کا معاملہ ہے۔ آدمی اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے یہ کہہ دیتا ہے کہ میرے ساتھ امتیاز کا معاملہ کیا گیا۔

جب بھی کسی انسان کے دل میں اس قسم کی شکایت پیدا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو الزام دینے کا طریقہ اختیار نہ کرے، وہ خود اپنے بارے میں سوچے۔ اگر وہ غیر جانبدارانہ طور پر اپنے بارے میں سوچے گا تو وہ جان لے گا کہ یہ دراصل میری اپنی کمزوری تھی جس کی مجھے قیمت دینی پڑی۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ میں اپنی کمزوری کو دور کروں۔ اس کے بعد مجھے کسی سے امتیاز کی شکایت نہ ہوگی۔

اجتماعی زندگی میں دوسرے کی شکایت کرنا یا دوسرے پر الزام دینا صرف اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے، جو اس طرح کی شکایت یا الزام کا مصداق ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ اس طرح کی صورت پیش آئے تو وہ فوراً اپنا محاسبہ کرے۔ وہ اپنی کوتاہی کو دریافت کرے، اور اپنی کوتاہی کی تلافی میں لگ جائے۔ یہی بات اسلام کے مطابق ہے، اور یہی بات عقل کے مطابق بھی۔

جنت کی دنیا

قرآن کی سورہ نمبر 35 میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت جب جنت کی زندگی کا تجربہ کریں گے تو اس کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (35:34) یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایک ایسی دنیا ہوگی جو درد اور غم سے مکمل طور پر خالی ہوگی۔

اہل جنت کا یہ کلمہ، ایک بہت معنی خیز کلمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سی دنیا ہے، جو انسان جیسی مخلوق کے لئے خوشیوں کی دنیا بن سکتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جو حزن (pain) سے خالی ہو۔ انسان بے حد حساس مخلوق ہے۔ حزن کا معمولی سا تجربہ بھی انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔ انسان کو رہنے کے لئے ایک ایسا محل مل جائے جس میں بظاہر آرام کے تمام سامان موجود ہوں لیکن اسی کے ساتھ اس میں رہنے والے انسان کو کوئی حزن لاحق ہو۔ مثلاً، اس کے ایک دانت میں درد پیدا ہوجائے تو انسان اتنا بے چین ہوجائے گا کہ محل میں موجود آرام وراحت کے تمام سامان اس کے لئے بے معنیٰ ہو جائیں گے۔ انسان جیسی مخلوق کے لئے صرف وہ دنیا خوشی کی دنیا بن سکتی ہے، جو حزن سے مکمل طور پر پاک ہو۔

انسان کی نسبت سے قرآن کا یہ بیان کامل معنوں ایک مبنی بر واقعہ بیان (factual statement) ہے۔ اتنا زیادہ مبنی بر واقعہ بیان کسی انسان کے لئے ممکن نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بیان اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کی کتاب ہے جو تمام حقائق سے کامل واقفیت رکھتا ہے۔

مزید یہ کہ ایک ایسی دنیا بنانا جو کامل معنوں میں انسان کے تخلیقی ساخت سے مطابقت رکھتی ہو، ایک ایسا کام ہے جو صرف رب العالمین کے لئے ممکن ہے۔ یعنی ایک ایسا رب جو پورے معنوں میں عالمی اختیارات کا مالک ہو۔ اس طرح یہ آیت خدا کے وجود کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہے، اور اس بات کا ثبوت بھی کہ قرآن، رب العالمین کا کلام ہے، وہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

اجتہاد کا معاملہ

اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ حالات بدلنے کے بعد ابتدائی حکم کی نئی تطبیق (new application) تلاش کی جائے۔ مثلاً جدید طرز کے صنعتی موزہ (socks) کے وجود میں آنے کے بعد اس پر قدیم طرز کے جراب کے حکم کو منطبق کرنا۔

اجتہاد صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ لیکن اس اندیشہ کی بنا پر کبھی اجتہاد کے عمل کو روکا نہیں جائے گا۔ صرف یہ کیا جائے گا کہ اجتہاد کے لئے اخلاص نیت کی شرط پر زور دیا جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی مومن اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد درست ہو تو اس پر اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اور اگر وہ اخلاص نیت کے باوجود اجتہاد میں غلطی کر جائے تو اس کو اس کے اجتہاد پر ایک ثواب ملے گا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کے معاملہ میں ہمیشہ غلطی کا امکان رہتا ہے حتی کہ بڑے بڑے اہل ایمان نے بھی غلطیاں کی ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ جب اس پر اجتہاد کی غلطی واضح ہو جائے تو وہ کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور وہ اپنی رائے کو درست کر لے۔

اجتہاد ایک تعمیری عمل ہے۔ اجتہاد سے لوگوں کے اندر تخلیقی سوچ (creative thinking) پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب اجتہاد کا عمل رک جائے تو یقینی طور پر لوگوں کے اندر ذہنی جمود (intellectual stagnation) پیدا ہو جائے گا، اور ذہنی جمود بلاشبہہ اسلام میں ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ جب کوئی آدمی اخلاص نیت کے ساتھ اجتہاد کرے تو فطری طور پر ایسا ہوگا کہ وہ معاملہ پر گہرائی کے ساتھ غور کرے گا، وہ سنجیدگی کے ساتھ اس کا جائزہ لے گا۔ وہ اس موضوع پر کتابوں کا مطالعہ کرے گا۔ وہ اہلِ علم سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرے گا۔ یہ تمام چیزیں اخلاص نیت میں شامل ہیں۔ ان چیزوں کا ہونا اخلاص نیت کا ثبوت ہے اور ان چیزوں کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے اندر اخلاص نیت موجود نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو حدیث میں اس طرح بتائی گئی ہے کہ عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔

قتل سب سے بڑی برائی

قتل کیا ہے۔ قتل یہ ہے کہ کسی زندہ انسان پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ معاملہ ایک فرد کے ساتھ کیا جائے تو اس کو قتل کہا جاتا ہے، اور یہی معاملہ جب زیادہ بڑے پیمانے پر کیا جائے تو وہ جنگ ہے۔ قتل ہو یا جنگ، وہ ہر حال میں برائی کے افعال ہیں۔ کسی انسان کو مارنا، ایک ایسا فعل ہے، جو اس قابل ہے کہ مارنے والے کو سب سے زیادہ سخت سزا دی جائے۔

ہر انسان خدا کی تخلیق ہے۔ ہر انسان کو اس کے خالق نے اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ دنیا میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارے اور خالق نے اس کو جس امکان (potential) کے ساتھ پیدا کیا ہے اس کو وہ اپنی محنت سے واقعہ (actual) بنائے۔

حقیقت یہ ہے ہر انسان خالق کا ایک منصوبہ (plan) ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو قتل کرنا، گویا خالق کے منصوبے کو قتل کرنا ہے۔ وہ خالق کے منصوبے کو ناکام بنانے کے ہم معنی ہے۔ جنگ بظاہر انسان کے خلاف ہوتی ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہر جنگ خالق کے خلاف جنگ ہے۔

جنگ کا آغاز نفرت سے ہوتا ہے۔ نفرت بڑھ کر تشدد بن جاتی ہے۔ تشدد جب زیادہ بڑے پیمانے پر کیا جائے، اسی کا نام جنگ ہے۔ تشدد کلچر اپنے آغاز میں بھی غلط ہے، اور اپنے انجام میں بھی غلط۔ کوئی بھی منطق (logic) تشدد اور خوں ریزی کو ہرگز جائز ثابت کرنے والی نہیں۔

ایک درخت زمین سے نکلے اور ہری بھری شاخوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگے تو وہ خالق کے منصوبے کا ایک جز ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے ایک پودے یا درخت کو کاٹ دے تو اس نے بلاشبہ ایک ناقابلِ معافی جرم کیا، اس نے ایک تخلیقی منصوبے کو پورا ہونے سے پہلے ختم کر دیا۔ انسان بھی خالق کا ایک زندہ درخت ہے۔ انسان کے لیے خالق کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ زمین میں پھیلے یہاں تک کہ وہ باغ بن جائے۔ ایسی حالت میں جو شخص خدا کے باغ پر ہتھیار چلاتا ہے،

وہ خود اپنے اوپر ہتھیار چلاتا ہے۔ ایسا انسان اپنے پرتشدد عمل سے خدا کے فیصلے کو بدلنا چاہتا ہے، مگر خالق کا فیصلہ کبھی بدلنے والا نہیں۔

خالق کا منشا ہے کہ یہ دنیا انسانوں کا ہرا بھرا باغ بن جائے۔ اس باغ کا ہر درخت پھول اور پھل دے کر دنیا کی ترقی میں اضافہ کرے، ہر انسان اپنے پوٹنشل (potential) کو ایکچول (actual) بنا کر خالق کے منصوبے کی تکمیل کرے۔ ہر انسان تہذیب (سویلائزیشن) کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرے۔ ہر انسان دنیا میں آزادانہ عمل کرکے خود کچھ پائے، اور اپنے پائے ہوئے کو اگلی نسلوں کی طرف منتقل کرے۔ ہر انسان تاریخ کا ایک صحت مند حصہ (healthy part) بن جائے۔ مگر تشدد کلچر (culture of violence) اس پوری خدائی اسکیم کو برباد کردینے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تشدد (violence) سب سے بڑا جرم ہے۔ ایسے مجرمین کے لیے بلاشبہ خدا کے یہاں سخت عذاب ہے۔ کوئی بھی خود ساختہ نظریہ تشدد کے مجرمین کو جنت میں پہنچانے والا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تشدد پسند انسان دنیا میں کانٹے دار جھاڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے انسانوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ کاٹے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لیے کائنات کے کوڑا خانہ میں پھینک دیا جائے۔

امن (peace) تعمیر کا عمل ہے، اس کے مقابلے میں جنگ تخریب کا عمل ہے۔ امن پسند انسان کے لیے خدا کے یہاں ابدی آرام گاہ ہے۔ اور تشدد پسند انسان کے لیے خدا کے یہاں ابدی قید خانہ۔

انسان اس دنیا میں آزاد ہے، لیکن اس کی آزادی محدود آزادی ہے۔ اس کی آزادی اس لیے ہے کہ وہ اس کو خالق کے منصوبے کے مطابق استعمال کرے۔ مگر جو شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے، وہ اپنے عمل سے صرف یہ ثابت کررہا ہے کہ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کو آزادی دی جائے، وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کو عقل دی جائے، جس کے ذریعے وہ اچھے برے کو سمجھ سکتا تھا، اور اپنی زندگی کی درست تشکیل کرسکتا تھا۔

ایسی حالت میں جو انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اگلے دورِ حیات میں اس کو جانور (animal) سے بھی زیادہ بری صورت میں اٹھایا جائے۔ اگلے دورِ حیات میں وہ صرف محرومی کی زندگی گزارے، اگلے دورِ حیات میں اس کا حال یہ ہو کہ وہ پکارے، لیکن کوئی اس کی پکار کا جواب دینے والا موجود نہ ہو، وہ مدد کے لیے آواز دے، لیکن وہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا موجود نہ ہو۔

کسی شخص کا انسان کی حیثیت سے پیدا ہونا خالق کا ایک انوکھا انعام ہے۔ مزید یہ کہ وہ خالق کی طرف سے ایک خوش خبری ہے۔ اس بات کی خوش خبری کہ اگر تم نے اپنی موجودہ زندگی کو خالق کے نقشے کے مطابق گزارا، اگر تم نے تشدد کے بجائے امن کو اپنا طریق حیات بنایا تو اگلے دورِ حیات میں تم کو خالق کی مزید عنایات حاصل ہوں گی۔ آج تم انسان (man) کی حیثیت سے پیدا کیے گیے ہو۔ لیکن اگلے دورِ حیات میں خالق تم پر یہ انعام کرے گا کہ وہ تم کو فوق البشر (superman) کا درجہ دے دے گا۔ موجودہ دورِ حیات میں تم نے سب کچھ کر کے بھی بربادی کے سوا کچھ اور نہیں پایا تھا، لیکن اگلے دورِ حیات میں تم خالق کی ایسی نعمتوں کو پا لوگے جس کا اس سے پہلے تم نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

سہارن پور (یوپی) میں مولانا وحید الدین خاں کی اردو، ہندی اور انگریزی کتابیں،
قرآن مجید کے ترجمے، دعوتی لٹریچر اور ماہ نامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Dr. M. Aslam Khan (Principal)
National Medical IGNOU Community College
38 Ayodhyapuram, Mahipura, Dehradun Road, Saharanpur, U.P.
www.nmicc.com, dr_aslm@rediff.com, +919997153735

بنگلور میں مولانا وحید الدین خاں کی اردو، ہندی اور انگریزی کتابیں، دعوتی لٹریچر، ماہ نامہ الرسالہ اور سبسکرپشن آف انگریزی الرسالہ (*Spirit of Islam*) کے لئے رابطہ قائم فرمائیں:

Centre for Peace, Bangalore
Tel. 080-22118978, Mob. 09060511653
Email.: thecentreforpeace@gmail.com

ذاتی کمال، بصیرِ زمانہ

مصلح یا مجدد کا جب ذکر ہوتا ہے، تو اکثر لوگ اس کے ذاتی کمالات کو بیان کرنے لگتے ہیں۔ قدیم زمانے سے چوں کہ دنیا میں شخصیت پرستی (cult of individual) کا طریقہ رائج رہا ہے۔ اس لیے یہ طریقہ معیار بن گیا ہے۔ مصلح یا مجدد کا بیان لوگ اس طرح کرتے ہیں، جیسے کہ ایک فرد کے شخصی کمالات کو بیان کرنا ہی اس کا اصل طریقہ ہے۔ چناں چہ اکثر لوگ مصلح یا مجدد کا بیان اس طرح کرتے ہیں، جیسے کہ وہ اس کی قصیدہ خوانی کررہے ہیں۔

مگر یہ طریقہ درست نہیں۔ مصلح یا مجدد کا کام یہ ہے کہ وہ حدیث کے الفاظ میں بصیرِ زمانہ ہو، وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرے۔ اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مصلح یا مجدد اس بات کا حامل ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس بات کا حامل نہ ہو تو مصلح یا مجدد کو یہ مشورہ دینا چاہیے کہ تم سب سے پہلے اپنے آپ کو اس کے مطابق بناؤ۔

مصلح یا مجدد کا کام مفتی کے کام سے مختلف ہے۔ مفتی کا کام یہ ہے کہ وہ مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بیان کردے۔ لیکن مصلح یا مجدد کی ذمے داری اس سے زیادہ ہے۔ مصلح یا مجدد کو سب سے پہلے اپنے کو دین کا عالم بنانا ہے۔ اس کے بعد اس کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمانے سے باخبر کرے تاکہ اس کی رہنمائی میں زمانے کی رعایت شامل ہو۔ جس آدمی کی رہنمائی میں زمانے کی رعایت شامل نہ ہو، وہ مصلح یا مجدد کا درجہ پانے کے قابل نہیں۔

دین ہمیشہ کے لیے ایک ہے۔ لیکن زمانی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ دین کی ابدی تعلیمات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ لوگوں کو اپنے حسب حال دکھائی دے۔ اگر دین کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ لوگوں کو زمانی تقاضوں کے مطابق نظر نہ آئے تو وہ لوگوں کے ذہن کو ایڈریس نہیں کرے گا۔ اس کے بعد لوگوں کے اندر یہ شوق پیدا نہ ہوگا کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق بنائیں۔

قدرت کا نظام

قدرت کا نظام فرق (difference) کے اصول پر قائم ہے۔ ہر انسان ایک الگ قسم کی امتیازی صفت (distinctive quality) لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی اس امتیازی صفت کو دریافت کرے۔ دریافت کرنے کا یہ کام انسان کو خود کرنا پڑتا ہے۔ ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس معاملہ میں ذاتی دریافت (self discovery) پر کھڑا ہو۔

ذاتی دریافت کے اس عمل میں سب سے بڑا معاون عنصر (supporting element) یہ ہے کہ انسانی سماج کو مبنی بر میرٹ (merit-based society) بنایا جائے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اپنے ماحول میں اس کو مختلف قسم کے کام نظر آتے ہیں۔ وہ مختلف تجربے کرتا ہے۔ اس تجربہ کے دوران اس کو اشارہ ملتا ہے کہ فلاں کام کو میں زیادہ اچھا کرسکتا ہوں۔ یہ اشارہ اس کے لئے اس بات کا ایک طاقت ور محرک (strong incentive) بن جاتا ہے کہ وہ اپنی دریافت کردہ امتیازی صفت کو اپنے عمل کا نشانہ بنائے۔ اس طرح مبنی بر میرٹ سماج میں اپنے آپ ایک خاموش عمل شروع ہوجاتا ہے۔ یہ آٹو میٹک چینلا ئزیشن (automatic channelization) کا عمل ہے۔

اگر آدمی سنجیدہ ہو، اور دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے اپنا محاسبہ (introspection) کرنا جانتا ہو تو وہ نہایت آسانی سے یہ دریافت کرلے گا کہ اس کے لیے زندگی کی جدوجہد میں سفر کرنے کی سمت کیا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے بزنس شروع کیا اس میں اس نے دیکھا کہ وہ زیادہ کامیاب نہیں ہورہا ہے، تو اس کو یہ جاننا چاہیے کہ اس کے لیے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ بزنس کے بجائے سروس کے میدان میں چلا جائے۔ اگر آدمی اس طرح اپنا راستہ متعین کرے تو وہ یقینا اپنے لیے اپنے موافق زندگی کی تعمیر میں کامیاب ہوجائے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنا آزادانہ جائزہ لیتا رہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو دریافت کرے گا اور اپنے آپ کو سماج کا صحت مند ممبر بنانے میں کامیاب ہوجائے گا۔

سب سے بڑا المیہ

انسانی تاریخ کا شاید سب سے بڑا المیہ (tragedy) یہ ہے کہ انسان معرفت اعلیٰ کے حصول سے محروم رہا۔ خدا کی معرفت کا ذریعہ، خدا کی تخلیقات میں غور وفکر کرنا ہے۔ جدید سائنسی دور سے پہلے انسان تخلیقاتِ الٰہی کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ چناں چہ قدیم زمانے میں معرفت اعلیٰ تک پہنچنے کے لئے فریم ورک ہی موجود نہ تھا۔

موجودہ زمانے میں سائنسی انقلاب کے بعد انسان کو اعلیٰ فریم ورک حاصل ہوا۔ جس کی پیشگی خبر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ لیکن موجودہ زمانے میں جب یہ آفاقی یا سائنسی فریم ورک ظہور میں آیا تو عین اُسی وقت تمام دنیا کے مسلمان سیاسی ردعمل کے نتیجے میں منفی سوچ کا شکار ہو گئے۔ اس طرح وہ مثبت سوچ سے محروم رہے۔

قدیم زمانے کے انسان کے لیے سائنسی فریم ورک نہ ہونے کی بنا پر معرفتِ اعلیٰ تک پہنچنا مشکل تھا۔ موجودہ زمانے میں سائنسی فریم ورک کے ظہور کے باوجود انسان معرفتِ اعلیٰ تک نہیں پہنچا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانے کا انسان مثبت سوچ سے محروم ہو گیا۔ یہ بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی محرومی تھی۔

اللہ کی معرفت اعلی کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ معرفت اعلی تک پہنچ سکے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منفی سوچ سے مکمل طور پر بچائے۔ وہ ہر حال میں مثبت سوچ میں جینے والا بنے۔ جو لوگ اس شرط کو پورا کریں وہ یقیناً معرفت اعلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ بیشتر انسان کسی نہ کسی بات کو لے کر منفی سوچ کا شکار ہو گیے۔ وہ مثبت سوچ (positive thinking) پر قائم نہ رہ سکے۔ اس بنا پر وہ معرفت کا وعایہ (container) نہیں بنے۔ معرفت اعلی سے محرومی کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔

حکمتِ حیات

حضرت یوسف ایک اسرائیلی پیغمبر تھے۔ ان کو مصر کے بادشاہ نے یہ موقع دیا کہ وہ پورے ملک کے خزائن ارض (یوسف: 55) کو استعمال کریں۔ بادشاہ کی شرط صرف ایک تھی۔ وہ یہ کہ سلطنت کا تخت بدستور اس کے پاس رہے گا۔

Only with regard to the throne, will I be greater than you. (Genesis 41:40)

حضرت یوسف نے بادشاہ کی اس شرط کو مان لیا، اور وہ اپنی آخر عمر تک ملک مصر کے مواقع کو آزادانہ طور پر استعمال کرتے رہے۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ موقع مزید اضافے کے ساتھ حاصل ہے۔ موجودہ زمانے میں چالیس سے زیادہ مسلم ممالک ہیں۔ ہر ملک کے مسلم حکمراں زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ میرے خلاف اینٹی گورنمنٹ تحریک نہ چلاؤ اور پھر ملک کے تمام مواقع تمہارے لئے آزادانہ طور پر کھلے رہیں گے۔ تم تمام غیر سیاسی میدانوں میں عمل کرنے کے لیے آزاد ہو۔

مگر موجودہ زمانے میں یہ امکان غیر استعمال شدہ رہ گیا۔ کسی مسلم ملک میں بھی اس موقع کو استعمال نہ کیا جاسکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنما حضرت یوسف کی اس پیغمبرانہ سنت پر عمل نہ کر سکے۔ اس کے برعکس ان مسلم رہنماؤں نے ہر مسلم ملک میں یہ کیا کہ وہ حکومت کے حریف بن گیے۔ انھوں نے اینٹی گورنمنٹ سرگرمیاں شروع کردیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک کے حکمراں اپنے دفاع کے طور پر مسلم رہنماؤں کے خلاف ہوگیے۔ ہر مسلم ملک میں مسلم تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ مسلم ملکوں میں دعوت اور تعلیم جیسے میدانوں میں کام کے غیر معمولی مواقع تھے۔ مگر یہ مواقع غیر استعمال شدہ رہ گیے۔ مسلم رہنماؤں پر لازم تھا کہ وہ اپنا محاسبہ کرتے، وہ اپنی غلطی کو دریافت کرتے۔ لیکن انھوں نے برعکس طور پر یہ اعلان کیا کہ یہ مسلم حکمراں اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ اب ہر مسلم ملک میں مسلمانوں کے دو گروہ بن گیے۔ حکومتی گروہ اور غیر حکومتی گروہ۔ دونوں گروہوں کے درمیان نفرت اور تشدد کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

حقیقی اطمینان

زندگی میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کے لئے سپریم چیز کیا ہے۔ میں اپنے تجربے کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ کسی انسان کے لئے سپریم چیز پیس آف مائنڈ ہے۔ کسی انسان کے لئے سپریم چیز نہ تو دولت ہے، نہ شہرت (fame) ہے، نہ پاور ہے، اور نہ پاپولیریٹی (popularity)۔ کسی انسان کے لئے سپریم دریافت وہی چیز ہوسکتی ہے جو اس کو فل فل مینٹ (fulfilment) دے۔ اور تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ پیس آف مائنڈ کے سوا کوئی اور چیز انسان کو فل فل مینٹ نہیں دیتی۔

پیس آف مائنڈ کی یہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیس آف مائنڈ انسان کی نیچر کے مطابق ہے۔ انسان اپنے نیچر کے مطابق یہ چاہتا ہے کہ وہ آخری حد تک اپنے آپ کو مطمئن بنا سکے۔ مگر کسی انسان کو اطمینان صرف داخلی اچیومینٹ (achievement) پر ہوسکتا ہے، خارجی اچیومینٹ پر نہیں۔ اسی داخلی یافت کا دوسرا نام انٹلکچول ڈیولپمینٹ یا اسپریچول ڈیولپمینٹ ہے۔ امریکی دولت مند بل گیٹس (Bill Gates) نے دولت کے بارے میں اپنے تجربے کو ان الفاظ میں بیان کیا:

Once you get beyond a million dollars, it's the same hamburger.

بل گیٹس نے جو بات دولت کے بارے میں کہی ہے، وہی بات ہر خارجی اچیومینٹ کے لئے درست ہے۔ یہ خارجی اچیومینٹ خواہ دولت ہو، یا بزنس ہو، یا فیم ہو، یا پولٹیکل پاور ہو، یا اور کوئی مادی چیز ہو۔ ایسی حالت میں انسان کو چاہئے کہ وہ پیس آف مائنڈ کا فارمولا دریافت کرے۔ اور یہ مقصد صرف انٹلکچول ڈیولپمنٹ کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ یعنی اسٹڈی اور contemplation کے ذریعہ۔ میں ذاتی طور پر اسپریچول ڈیولپمینٹ کو بہت اہمیت دیتا ہوں، لیکن میرے نزدیک اسپریچول ڈیولپمینٹ ایک مائنڈ بیسڈ ڈسپلن (mind-based discipline) ہے، نہ کہ ہارٹ بیسڈ ڈسپلن (heart-based discipline)۔ مبنی بر قلب میڈیٹیشن (meditation) آدمی کو وجد (ecstasy) تک پہنچا سکتا ہے۔ جب کہ مبنی بر ذہن میڈیٹیشن آدمی کو انٹلیکچول ڈیولپمینٹ تک پہنچاتا ہے، اور انٹلیکچول ڈیولپمینٹ ہی پیس آف مائنڈ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

دو دنیائیں

ایک سائنسی قیاس کے مطابق، کائنات میں ہماری دنیا جیسی دو دنیائیں ہیں۔ ایک پازیٹو ورلڈ اور دوسری نیگیٹو ورلڈ۔ یہی قانونِ فطرت (law of nature) کا تقاضا ہے۔ جس طرح پازیٹو پارٹیکل اور نیگیٹو پارٹیکل کے بغیر ایٹم (atom) کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ایک دنیا کے وجود کے لیے دوسری دنیا کا وجود بھی ضروری ہے۔

یہ سائنسی قیاس ہر انسان کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ ہر انسان اپنے ذاتی تجربے کے تحت ایک دنیا پر یقین رکھتا ہے جو بظاہر اس کو دکھائی دیتی ہے، اور جس کے اندر وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ یہ دنیا وہ ہے جہاں وہ روزانہ صبح اور شام کے مناظر دیکھتا ہے۔ جس کے اندر وہ اپنی تمام سرگرمیاں جاری کرتا ہے۔ جس کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے، اور اپنے کان سے سنتا ہے، اور جہاں وہ روزانہ اپنے پاؤں سے چلتا ہے۔

اسی کے ساتھ ہر انسان ایک اور دنیا کا تصور اپنے ذہن میں لیے ہوئے ہے۔ ایک ایسی دنیا جو موجودہ دنیا کے مقابلے میں معیاری دنیا (perfect world) ہوگی، جہاں اس کی تمام خواہشیں (desires) پوری ہوں گی۔ جہاں اس کو کامل فل فلمینٹ (total fulfilment) ملے گا۔ ہر انسان پیدائشی طور پر پرفکشنسٹ ہوتا ہے۔ اپنے داخلی مزاج کے مطابق وہ اس معیاری دنیا کو پانا چاہتا ہے، مگر کوئی بھی شخص اپنی اس تلاش کا جواب نہیں پاتا، اور اس پر موت کا وقت آجاتا ہے۔ اس طرح ہر انسان کے ذہن میں ایک دنیا وہ ہے جس کو عملاً وہ پائے ہوئے ہے، اور دوسری دنیا وہ ہے جس کو وہ پانا چاہتا ہے، لیکن اس کو پانے میں وہ کامیاب نہیں ہوتا ہے۔

انسان کا یہ ذہن ہر ایک کے لیے اس بات کا ایک داخلی ثبوت ہے کہ یہاں دو دنیائیں موجود ہیں۔ ایک دنیا وہ جس کو وہ حال میں پارہا ہے، اور دوسری دنیا وہ جس کو وہ موت کے بعد مستقبل میں پائے گا۔ پہلی دنیا ہر ایک کا عملی تجربہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری دنیا وہ ہے جو ہر ایک کے ذہن میں بسی ہوئی ہے۔

انتہا پسندی

انتہا پسندی (extremism) ایک فطری صفت ہے۔ یہ صفت کسی شخص کے اندر کم ہوتی ہے اور کسی شخص کے اندر زیادہ۔ تاہم انتہا پسندانہ مزاج کا ایک تعمیری پہلو ہے اور دوسرا اس کا تخریبی پہلو۔ اس کا تعمیری پہلو یہ ہے کہ آدمی اصول کے معاملہ میں سخت حسّاس ہو، وہ دوسروں کے حقوق کے معاملہ میں کمی کو گوارا نہ کرے، وہ حق سے انحراف کو دیکھے تو تڑپ اٹھے۔ وہ اپنی غلطی کو شدید طور پر محسوس کرتا ہو۔ وہ اپنی کوتاہی کے معاملہ میں اس سے زیادہ شدید ہو جتنا کہ کوئی شخص دوسروں کی کوتاہی کے معاملہ میں شدید ہوتا ہے۔ یہ انتہا پسندی صحت مند انتہا پسندی ہے۔

انتہا پسندی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ منفی رخ اختیار کرلے۔ آدمی اپنے اس جذبہ کی بنا پر دوسروں سے نفرت کرنے لگے۔ وہ دوسروں سے لڑنے کے لیے تیار ہوجائے۔ وہ اصلاح کے نام پر جنگ اور قتل شروع کردے۔ یہ انتہا پسندی کی قابلِ اعتراض صورت ہے۔ جب انتہا پسندی اس قسم کی منفی صورت اختیار کرلے تو وہ عملاً ایک برائی (evil) بن جاتی ہے، نہ کہ کوئی خیر (good)۔

حساسیت (sensitivity) انسان کی خاص صفت ہے۔ اس صفت کا تعمیری استعمال دنیا میں بھلائی کا سبب بنتا ہے۔ اس کے برعکس، جب اس صفت کا غلط استعمال ہونے لگے تو دنیا برائی سے بھر جائے گی۔

انتہا پسندی کا مزاج ہمیشہ محاسبہ کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ محاسبہ اپنے خلاف ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس، اپنی کوتاہیوں سے غافل رہنا اور دوسروں کی کوتاہی پر ان سے لڑائی شروع کردینا سخت گناہ ہے۔ پہلا کردار اگر ثواب کا موجب ہے تو دوسرا کردار آدمی کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کا سخت مواخذہ کیا جائے۔

انتہا پسندی ایک فطری صفت ہے، جس طرح اعتدال پسندی ایک فطری صفت ہے۔ انتہا پسندی اس وقت برائی بن جاتی ہے، جب کہ اس کو عقل کے بجائے جذبات کے تابع کردیا جائے۔

معافی، رائے بدلنا

کچھ باتیں ایسی ہیں جو معافی سے ختم ہوجاتی ہیں۔ مثلاً کسی کو غصہ آگیا، اور غصے میں اس نے کوئی سخت بات کہہ دی، پھر اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا، اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی۔ یہ وہ بات ہے، جو معافی سے ختم ہوجاتی ہے۔

دوسری بات وہ ہے جو اس وقت ختم ہوتی ہے، جب کہ آدمی اپنی رائے بدل لینے کا اعلان کرے۔ مثلاً ایک شخص آپ کے بارے میں یہ کہے کہ آپ اسلام دشمن کے ایجنٹ ہیں، اور اس سے آپ کو پیسہ ملتا ہے، یہ بات صرف اس وقت ختم ہوگی جب کہ کہنے والا اپنی غلطی کا اعتراف کرے، اور اعلان کے ساتھ یہ کہے کہ میں نے جو کہا تھا، وہ صحیح نہیں تھا۔

وقتی جذبے کے تحت کوئی غلط بات منھ سے نکل جائے۔ پھر آدمی کو اس پر شرمندگی ہو، اور وہ صاحب معاملہ سے معافی مانگ لے۔ یہ معافی کا کیس ہوگا۔ صاحب معاملہ کو چاہیے کہ وہ معافی مانگنے کے بعد اس کو معاف کردے۔ وہ دل میں اس کے خلاف کدورت نہ رکھے۔

لیکن جو غلطی سوچی سمجھی رائے کے تحت ہو۔ وہ اس وقت تک قابل معافی نہیں، جب تک آدمی کا یہ حال نہ ہوجائے کہ وہ اپنی رائے کی غلطی دل سے مان لے۔ وہ سچے اعتراف کے جذبے کے تحت، صاحب معاملہ سے معافی کی درخواست کرے۔ ایسی حالت میں اس کی بات قابل معافی قرار پائے گی۔ اس کے بعد دونوں فریقوں کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس بات کے برے اثرات سے اپنے دل کو پاک کرلیں۔

معافی مانگنا اور معافی قبول کرنا دونوں عبادت کے افعال ہیں۔ معافی مانگنے والا معافی کے بعد ایسا ہوجاتا ہے گویا کہ اس نے غلطی نہیں کی تھی۔ اور معافی مانگنے کے بعد معاف کرنے والے کو اس بات کا کریڈٹ ملتا ہے کہ اس کا دل نفرت وعداوت سے خالی ہے۔ اس کے دل میں انسان کے لیے خیر خواہی ہے، نہ کہ نفرت اور انتقام۔

کلام کا طریقہ

گفتگو کے دو طریقے ہیں۔ایک یہ کہ گفتگو کے وقت جب دوسرا شخص آپ سے کوئی سوال کرے تو اس موضوع سے متعلق جو باتیں آپ کے دماغ میں موجود ہوں، ان سب کو آپ شروع سے آخر تک دہرانے لگیں۔ یہ طریقہ آدابِ گفتگو کے خلاف ہے۔ایسے شخص کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ گفتگو کے آداب کو نہیں جانتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ سامنے والے کی بات سنیں، اور پھر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ سائل کیا بات جاننا چاہتا ہے۔اور پھر وہی بات بولیں، جو سائل آپ سے سننا چاہتا ہے۔ یہ گفتگو کا صحیح طریقہ ہے۔اسی قسم کی گفتگو کامیاب گفتگو ہے، اور اسی قسم کی گفتگو نتیجہ خیز گفتگو ہے۔

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ گفتگو کے وقت وہ اپنے آپ میں جیتے ہیں۔ وہ دوسرے کی بات سننے سے زیادہ اپنی بات میں مشغول رہتے ہیں۔ایسے لوگ جب بولتے ہیں تو سننے والے کو ان کی بات سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

صحیح یہ ہے کہ آپ دوسرے کی بات کو خالی الذہن ہو کر سنیں، غیر جانب دارانہ انداز میں دوسرے کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، دوسرے کی بات کو دوسرے کے ذہن سے سنیں نہ کہ خود اپنے ذہن سے۔جو شخص ایسا کرے، وہی صحیح معنوں میں گفتگو کا طریقہ جانتا ہے۔

گفتگو خالق کی ایک عظیم نعمت ہے۔ انسان کے سوا دوسری کسی مخلوق کو یہ نعمت حاصل نہیں۔ پہاڑ اور سمندر کے درمیان کبھی گفتگو نہیں ہوتی۔ دو جانوروں کے درمیان کبھی تبادلۂ خیال نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان ہے جو کہنے اور سننے کی طاقت رکھتا ہے، اور بامعنی انداز میں تبادلۂ خیال کرتا ہے۔ اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر درست کلام کی صلاحیت پیدا کرے۔گفتگو کے وقت وہ اس اسپرٹ کے ساتھ گفتگو کرے کہ وہ دوسروں سے کچھ سیکھے اور خود دوسروں کو کچھ دینے کے قابل بات دے۔وہ صاحب تعلیم بھی ہو اور صاحب تعلّم بھی۔ایسے آدمی کی گفتگو بھی ایک عبادت ہے۔

افادہ اور استفادہ

ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (وفات 256ھ) اور محمد بن عیسیٰ الترمذی (وفات 279ھ)، دونوں ہم عصر تھے۔ دونوں کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے۔ اگرچہ امام البخاری کو اولیت حاصل ہے۔ امام الترمذی، امام البخاری کے شاگرد تھے۔ تاہم امام البخاری نے اپنے شاگرد امام الترمذی سے کہا: ماانتفعتُ بك اكثر مما انتفعتَ بي (التہذیب لابن حجر 9/389) یعنی میں نے تم سے اس سے زیادہ فائدہ اٹھایا جتنا تم نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔

یہ کوئی فضیلت یا علمی کمال کی بات نہیں، بلکہ وہ ایک فطری حقیقت ہے۔ جو کہ افادہ اور استفادہ کی صورت میں دونوں فریق کو حاصل ہوتا ہے۔ افادہ کا مطلب دوسرے کو فائدہ پہنچانا، جس کو تعلیم کہا جاتا ہے۔ اور استفادہ کا مطلب تعلم (learning) ہے۔ یعنی دوسرے سے سیکھنا۔

اصل یہ ہے کہ دو انسان آپس میں سنجیدہ گفتگو کریں، دونوں کے درمیان کھلا ماحول ہو، دونوں کو یہ موقع ہو کہ وہ اپنی بات کو کسی تحفظ (reservation) کے بغیر دوسرے سے کہیں تو ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دو نقطۂ نظر کے درمیان ٹکراؤ سے معاملے کا ایک تیسرا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس طرح دونوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ گفتگو کو اپنے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنائیں، دونوں ایک دوسرے سے سیکھیں بھی اور سکھائیں بھی۔

دو یا چند انسانوں کے درمیان تبادلۂ خیال (exchange) بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ ہمیشہ ہر فریق کے لیے فائدے کا سبب بنتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تبادلہ خیال کے دونوں فریق سنجیدہ ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں سچائی کے طالب ہوں۔ ان کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ نہ تعریف سے خوش ہوں اور نہ وہ تنقید کو برا مانیں۔ وہ کسی بات کو بات کے لحاظ سے دیکھیں، نہ کہ اپنی ذات کے اعتبار سے۔ وہ تعصب سے خالی ہو کر اپنی بات کہیں اور دوسرے کی بات سنیں۔ ان کے اندر یہ مزاج نہ ہو کہ اپنی بات کو ہر حال میں صحیح ثابت کرنا ہے، اور دوسرے کی بات کو ہر حال میں رد کرنا ہے۔

ہرصورتِ حال بہتر

مشہور صحابیٔ رسول حضرت علی بن ابی طالب کا قول ہے: الخیر فیما وقع۔ یعنی جو ہوگیا، وہی بہتر ہے۔

Whatever happened, happened for the good.

حضرت علی کا یہ قول فطرت کے قانون کو بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں مواقع کی تعداد بے شمار ہے۔ اگر ایک موقع کھوجائے تو آدمی کے اندر محرومی کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو یہ امید کرنا چاہیے کہ ایک موقع کھونے کے بعد جلد ہی اس کو دوسرا موقع مل جائے گا، اس طرح اس کی زندگی کا سفر رکے بغیر جاری رہے گا۔

یہ صرف ایک قول نہیں ہے بلکہ فطرت کا ایک عام قانون ہے۔ یہ مومن وغیر مومن سب کے لیے ہے۔ اگر آدمی اس حقیقت کو دھیان میں رکھے تو وہ کبھی مایوس نہیں ہوگا۔ وہ ہر ناکامی کو وقتی سمجھے گا۔ ہر ناکامی کے بعد وہ اپنی کوشش کو جاری رکھے گا، یہاں تک کہ وہ کامیاب ہوجائے گا۔ یہ بات کوئی پراسرار بات نہیں۔ یہ فطرت کا ایک معلوم قانون ہے۔

خالق نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مواقع (opportunities) اتنے زیادہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کچھ مواقع ایسے ہیں، جو بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ اور زیادہ مواقع ایسے ہیں، جو موجود رہتے ہیں لیکن وہ ظاہری طور پر دکھائی نہیں دیتے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ پر امید رہے۔ وہ ناموافق حالات میں بھی مواقع کی تلاش جاری رکھے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر یہ استعداد پیدا کرے کہ وہ مواقع کو اپنے حق میں استعمال کرسکے، مواقع جس ہنر (skill) کا تقاضا کریں، وہ ہنر اپنے اندر پیدا کریں۔

مواقع کو وہی لوگ کامیابی کے ساتھ استعمال کرسکتے ہیں، جن کے اندر مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ضروری لیاقت موجود ہو۔ لیاقت کے بغیر مواقع کا کامیاب استعمال ممکن نہیں۔

ہر آدمی ایک کیس ہے

اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ جب کسی سے اپنی پسند کی بات سنتے ہیں تو وہ اس سے خوش ہوجاتے ہیں، اور اگر وہ اس سے اپنی پسند کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو وہ اس کے بارے میں بُری رائے قائم کرلیتے ہیں۔ یہ طریقہ آدابِ ملاقات کے خلاف ہے۔ ملاقات کا مقصد ایک انسانی مطالعہ ہے، نہ کہ لوگوں کے بارے میں اچھی رائے یا بُری رائے قائم کرنا۔

ہر انسان ایک کامل انسان ہے۔ وہ اپنی ذات میں پوری نوعِ انسانی کا نمائندہ ہے۔ ہر عورت اور مرد کا ردعمل گویا پوری انسانیت کا ردعمل ہے۔ ہر انسان کا مطالعہ گویا پوری انسانیت کا مطالعہ ہے۔ ایک انسان کو جان لینا گویا پوری نوعِ انسانی کو جان لینا ہے۔

اس اعتبار سے ہر انسان گویا انسانیت کی ایک لائبریری ہے۔ اگر آپ کے اندر غیر جانبدارانہ سوچ ہے، اگر آپ تعصب سے خالی ہوکر انسان کا مطالعہ کرسکتے ہیں تو ہر انسان آپ کے لئے پوری انسانیت کے مطالعے کا ذریعہ بن جائے گا۔ آپ ایک انسان کو دریافت کرکے تمام انسانوں کو دریافت کرلیں گے، حتی کہ آپ کا محدود خاندان وسیع تر معنوں میں انسانیت کی ایک لائبریری بن جائے گا۔

ہر انسان کبھی خوش ہوتا ہے، کبھی غمگین ہوتا ہے، کبھی وہ مثبت ردعمل کا اظہار کرتا ہے اور کبھی منفی ردعمل کا اظہار۔ اسی طرح وعدہ پورا کرنا اور وعدہ پورا نہ کرنا، شکایت کو درگزر کرنا اور درگزر نہ کرنا، دیانت داری کے ساتھ معاملہ کرنا اور بددیانتی کے ساتھ معاملہ کرنا، صدق بیانی کرنا اور کذب بیانی کرنا، مدلل اختلاف کرنا اور الزام تراشی کرنا، قابلِ پیشین گوئی کردار کا حامل ہونا اور ناقابلِ پیشین گوئی کردار کا نمونہ بن جانا، وغیرہ۔ اس طرح کا ہر معاملہ بظاہر ایک انسان کی طرف سے پیش آتا ہے، لیکن وسیع تر معنوں میں وہ تمام انسانوں کے سلوک کو بتاتا ہے۔ اگر آپ کے اندر گہرا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہوتو آپ ایک فرد کے اندر تمام افراد کو دیکھیں گے۔ آپ ایک خاندان کے اندر پوری انسانیت کے معاملے کو دریافت کرلیں گے۔ بشرطیکہ آپ کے اندر بصیرت (wisdom) کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔

اپنی تعمیر آپ

زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے وہ خالق کی طرف سے ایک منفرد صلاحیت (unique quality) کو لے کر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہر انسان ایک غیر معمولی دماغ (mind) لے کر آتا ہے۔ ہر انسان کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ اپنے دماغ کو استعمال کر کے اپنی صلاحیت کو دریافت کرے، اور دانش مندانہ پلاننگ کے تحت اپنے پوٹینشل (potential) کو واقعہ (actual) بنائے۔ ہر آدمی کامیابی کے ساتھ اس کو انجام دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے ذہن کو استعمال کرے۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو تائیدی نظام (supporting system) کہا جا سکتا ہے۔ فطرت کے مطابق یہ ہونا چاہئے کہ سماج کا نظام مکمل طور پر میرٹ (merit) کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ مبنی بر میرٹ سماج (merit-based society) کے اندر فطری طور پر ایک عمل قائم ہو جاتا ہے، جس کو آٹو میٹک چینلائزیشن (automatic channelization) کہا جا سکتا ہے۔ اس عمل (process) کے دوران اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی آخر کار اپنی استثنائی خصوصیت کو دریافت کر لیتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر اس بات کا طاقتور محرک پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے سماج میں امتیازی درجہ حاصل کرے۔ یہ داخلی اسپرٹ اپنا کام کرتی ہے۔ آدمی نے اگر غلط چوائس (choice) لے لیا ہے تو وہ اس کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے چوائس کو بدلے اور اس چوائس کو لے جس میں وہ اکسل (excel) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس داخلی اسپرٹ کے ساتھ سماج کے اندر مبنی بر میرٹ نظام شامل ہو جائے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنے اس خصوصی رول کو پالیتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ انسان اگرچہ پیدا کرنے والے کی طرف سے پیدا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے بعد ہر انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی تعمیر آپ کرے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو سیلف میڈ مین (self-made man) بنائے۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 237

1۔ 6 فروری 2015 کو مالیگاؤں سی پی ایس کی ایک ٹیم نے مقامی سینٹ پال چرچ کا دورہ کیا اور چرچ کے منتظمین کے ساتھ وہاں باہمی بھائی چارگی پر ایک میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں مختلف موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ دوران گفتگو چرچ کے ذمہ داروں نے امن کے حوالہ سے صدر اسلامی مرکز کی کوششوں کا ذکر کیا۔ میٹنگ کے اختتام پر ان لوگوں کو ترجمہ قرآن اور مراٹھی زبان میں ترجمہ شدہ کتاب پیغمبر امن بطور تحفہ دی گئیں۔

2۔ کولکاتا کے تین یوتھ مزشر مشتا، مز انیا اور مسٹر دنیش نے پیغمبر اسلام کی زندگی پر مشتمل فلم 'دی میسیج' دیکھی۔ اس فلم کو دیکھنے کے بعد اسلام اور قرآن کے بارے میں جاننے کا ان کو شوق پیدا۔ تو انھوں نے کولکاتا سی پی ایس ٹیم کی ایک ممبر مز شبینہ علی سے ترجمہ قرآن کے لیے درخواست کیا۔ ان کی درخواست پر 11 جون 2015 کو انھیں ترجمہ قرآن مجید اور دیگر دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے دوستوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لئے ان کو قرآن کی دس کاپیاں اور دعوتی لٹریچر دیئے گئے۔ ان لوگوں نے اس کو قبول کرتے ہوئے بے حد خوشی شکریہ کا اظہار کیا۔ (محمد عبداللہ، کولکاتا)

3۔ 17 جون 2015 کو انڈیا میں رہائش پذیر رومانین بدھسٹ راہب مسٹر مارسل (Marcel) نے صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اسلام کے مطابق سچائی کیا ہے۔ صدر اسلامی نے انھیں اپنی زندگی کے تجربات سے بتایا کہ انھیں خدا کی دریافت کیسے ہوئی۔ آخر میں انھیں صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ بطور تحفہ دیا گیا۔

4۔ 23 جون، 2015 کو پونٹیفکل کونسل آف انٹر ریلیجز افیئرس (Pontifical Council for Interreligious Dialogue) کے نمائندوں پر مشتمل کرسچین فادرس کی ایک ٹیم صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے آئی، اور گلوبل کرسچین کمیونٹی کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کو رمضان کی مبارکباد پیش کی۔ اس میٹنگ کے دوران اس بات پر گفتگو ہوئی کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان امن کو کیسے فروغ دیا جائے۔ اس اس حوالے سے صدر اسلامی مرکز نے ان سے تفصیلی گفتگو کی۔ آخر میں ان تمام لوگوں کو انگریزی ترجمہ قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ دیا گیا، جس پر انھوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس ملاقات سے ان کو روحانی خوراک حاصل ہوئی ہے۔

5۔ 24 جون 2015 کو ریسرچ اسکالر مز بھاؤنا ملک نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کے بعد انھیں صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ بطور تحفہ دیا گیا، جسے انھوں نے بہت ہی خوشی اور شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

6۔ 30 جون 2015 کو پیس ہال (سہارن پور) میں روزہ افطار کا ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ افطار کے

بعد سی پی ایس سہارن پور کی چیر پرسن محترمہ شیاما دیوی نے ترجمہ قرآن، پرافٹ آف پیس، گاڈ ارائزز، ریلٹی آف لائف (کتابیں) لوگوں کے درمیان تقسیم کیں۔ جن لوگوں نے اس افطار پارٹی میں شرکت کی ان میں قابل ذکر نام یہ ہیں، سوامی پریم، سوامی ڈاکٹر ہرش، ڈاکٹر کے ایل اروڑا (پرنسپل مہاراج سنگھ کالج) اور ڈاکٹر کے کے شرما، وغیرہ۔ (ڈاکٹر محمد اسلم خان، سہارن پور)

7۔ 3 جولائی 2015 کو بعد نماز جمعہ عبدالصمد صاحب نے سی پی ایس پونہ کی ایک ٹیم کے ساتھ پونہ کے مسلم ادارے اعظم کیمپس میں کتابوں کی فری تقسیم کا پروگرام آرگنائز کیا۔ یہ تجربہ کافی کامیاب رہا۔

8۔ ذیل میں چند دعوتی تجربات وتاثرات دیئے جارہے ہیں:

- Maulana Sb, thank you for enriching our present life and the life Hereafter with your Sunday lectures. Every lecture provides us with wisdom and insight. May God bless you with good health. (Naseer Uddin, Hyderabad, India)

- سی پی ایس الہ آباد کے سنٹر پر مستقل طور پر مسلم جماعتوں کے ممبران اور کارکن آتے رہتے ہیں۔ ان میں ایک کالج کے پروفیسر بھی ہیں۔ پروفیسر صاحب ترجمہ قرآن ڈسٹری بیوشن کے ساتھ مولانا کی کتابوں کو بھی لوگوں کے درمیان عام کررہے ہیں۔ وہ لوگوں کو ان کتابوں کے مطالعہ کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ مسلم جماعتوں کے کارکنان میں معرفت الٰہی کی کمی ہے، جس کو صدر اسلامی مرکز کی کتابیں خاص طور سے ''کتاب معرفت'' کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے۔ (محمد ابرار نزالا، الہ آباد)

- مَیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں تھا کہ ایک نوجوان طالب علم میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا: ''(رمضان میں پڑھنے کے لیے) مجھے پاکٹ سائز عربی قرآن چاہئے، یہ کہاں مل سکتا ہے؟''۔ اس وقت میں نے اس کو ترجمہ قرآن دیا اور اس کے دوستوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لئے مزید ترجمۂ قرآن کی کچھ کاپیاں دیں۔ (محمد انس، دہلی)

کولکاتا میں الرسالہ مشن سے وابستہ افراد کی ماہانہ میٹنگ ہر ماہ کے آخری اتوار کو ہوتی ہے۔
یہاں مشن کی کتابیں بھی دستیاب ہیں۔

Mr. Abdullah (Co-ordinator)
2nd floor, 65 Colootola street, (Opposite SBI ATM),
Kolkata-700073
Mob. 09831345685

- اگر آپ کے پاس وقت کم ہے ...
- اور آپ مختصر وقت میں کسی تعمیری پرچہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ حکمت ونصیحت سے بھرپور سبق آموز واقعات مسلسل آپ کے مطالعہ میں رہیں ...
- اگر آپ عصری اسلوب میں اسلام کو پڑھنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ الحادولادینیت کی رد میں سائنٹفک مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ ایک ایسے رسالہ کے متلاشی ہیں جس میں قیامت کی یاددہانی، حشرونشر کی ہولناکیاں، جنت وجہنم کے مناظر، خدائے ذوالجلال کی تجلّیاں، سیرتِ رسول کی جھلکیاں، صحابۂ کرام کی بے مثال قربانیاں ہوں ...

تو آپ

ہر مقام پر دینی رسالوں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

مولانا وحیدالدین خاں صاحب کا دینی وفکری وعلمی ماہ نامہ

الرسالہ (اردو، انگریزی)

کا مطالعہ کیجئے

الرسالہ (اردو) کے لئے رابطہ فرمائیں:

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 08588822674, 011-465241511

الرسالہ (انگریزی) کے لئے رابطہ فرمائیں:

Spirit of Islam
Centre for Peace, Bangalore
Tel. 080-22118978, Mob. 09060511653
Email.: thecentreforpeace@gmail.com

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحاد ملّت
احیاء اسلام
اسباق تاریخ
اسفار ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصر حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دور جدید کا خالق
اسلام دین فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی جہاد (جدید)
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اظہارِ دین
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیہ
امن عالم
امہات المومنین (ڈاکٹر فریدہ خانم)
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغ جنت
پیغمبر اسلام
پیغمبر انقلاب
تذکیر القرآن

تاریخ دعوت حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویر ملت
تعارف اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیر انسانیت
تعمیر حیات
تعمیر کی طرف
تعمیر ملت
حدیث رسول
حقیقت حج
حقیقت کی تلاش
حکمتِ اسلام
حل یہاں ہے
حیات طیبہ
خاتونِ اسلام
خاندانی زندگی (پمفلٹ)
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوت اسلام
دعوت حق
دین انسانیت
دین کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دین و شریعت
دینی تعلیم
ڈائری 1983-84

ڈائری 1989-90
ڈائری 1991-92
ڈائری 1993-94
رازِ حیات
راہ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (پمفلٹ)
رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول
شتم رسول کا مسئلہ
شہادت: امت مسلمہ کا مشن (جدید)
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہور اسلام
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
عظمت قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علماء اور دور جدید
عورت معمارِ انسانیت

فسادات کا مسئلہ
فکر اسلامی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کتابِ معرفت
کشمیر میں امن
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کرچکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائل اجتہاد
مضامین اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (پمفلٹ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی شخصیت اور تحریک (ڈاکٹر فریدہ خانم)
میوات کا سفر
نار جہنم
نشری تقریریں
نئے عہد کے دروازے پر
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17

Islam and World Peace

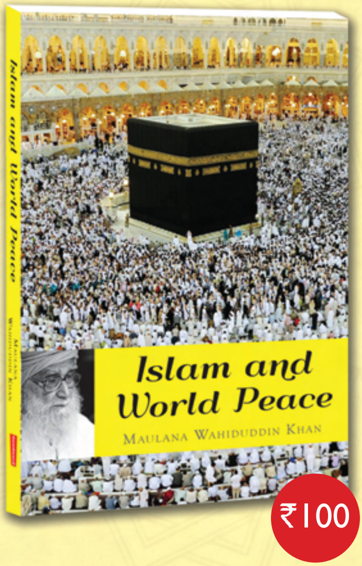

Lucidly written and expansive in scope, this work clears up the misunderstandings that abound on the subject of Islamic teachings about peace and war. It clearly states the authentic position on these matters, which is that Islam is a completely peaceful religion. In Islam, peace is the general rule or norm, and war is only an exception. Of the various names or attributes of God mentioned in the Quran, one is *As-Salam*, or 'The Source of Peace'. That is to say, God is Peace. Islam's mission centres on tawhid, the oneness of God. The Quran and the Prophet's life clearly aim to transform people's minds and hearts that they love just the one God, fear Him alone and make Him their greatest concern. This is the beginning of the Islamic mission as well as its finale. Ideal for students, scholars and the average reader, this brief and readable book provides keen insight into topics such as, the culture of peace, the 'Islamisation' of violence, terrorism, Islamic jihad, hijacking and hostage-taking, to name but a few.

Pages: 200